حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا نہایت اہم رسالہ
الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ آسان زبان میں

تسہیلِ انتباہاتِ مفیدہ

جدید اعتراضات
اور ان کے
تسلی بخش جوابات

تسہیل

مفتی محمد طلحہ صادق
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی | متخصص جامعہ اشرفیہ لاہور

مکتبۃ الذکر
0304-9366766

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا نہایت اہم رسالہ
”الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ“ آسان زبان میں

تسہیلِ انتباہاتِ مفیدہ

جدید اعتراضات
اور ان کے
تسلی بخش جوابات

تسہیل
مفتی محمد طلحہ صادق
فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی | متخصص جامعہ اشرفیہ لاہور

مکتبۃ الذکر
0304-9366766

جملہ حقوق بحقِ صاحبِ تسہیل محفوظ ہیں

کتاب کا نام	الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ
تسہیل کا نام	جدید اعتراضات اور ان کے تسلی بخش جوابات
تالیف	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
تسہیل	مفتی محمد طلحہ صادق
پہلی اشاعت	ربیع الاول ۱۴۴۷ھ - ستمبر ۲۰۲۵ء
دوسری اشاعت	رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ - فروری ۲۰۲۶ء
صفحات	۷۶
تعداد	۲۰۰
ناشر	مکتبۃ الذکر

کتاب منگوانے کے لئے رابطہ نمبر

0304-9366766

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
1	تقریظ مفتی عبد القدوس ترمذی صاحب	۵
2	تقریظ مولانا قاری محمد صادق صاحب	۶
3	پیش لفظ	۷
4	تعارف	۸
5	تمہید	۱۰
6	حکمت کی تعریف اور اقسام	۱۲
7	اصول نمبر ①	۱۵
8	اصول نمبر ②	۱۷
9	اصول نمبر ③	۱۸
10	اصول نمبر ④	۲۰
11	اصول نمبر ⑤	۲۱
12	اصول نمبر ⑥	۲۲
13	اصول نمبر ⑦	۲۳
14	تنبیہ ① مادہ حادث ہے	۲۷
15	تنبیہ ② اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے	۳۰
16	تنبیہ ③ نبوت	۳۳
17	تنبیہ ④ قرآن	۴۰

18	تنبیہ ۵ حدیث	۴۴
19	تنبیہ ۶ اجماع	۴۸
20	تنبیہ ۷ قیاس	۵۰
21	تنبیہ ۸ فرشتے، جنات اور ابلیس	۵۳
22	تنبیہ ۹ قبر کے حالات اور آخرت کے موجودات یعنی جنت، جہنم، پل صراط اور میزان	۵۵
23	تنبیہ ۱۰ بعض طبعی چیزیں	۵۸
24	تنبیہ ۱۱ تقدیر	۶۱
25	تنبیہ ۱۲ اسلام کے ارکان اور عبادات	۶۵
26	تنبیہ ۱۳ معاملات اور سیاسیات	۶۷
27	تنبیہ ۱۴ معاشرت اور خاص عادات	۶۹
28	تنبیہ ۱۵ باطنی اخلاق	۷۲
29	تنبیہ ۱۶ عقلی دلیل	۷۴
30	آخری گزارش	۷۶

❋...❋...❋

تقریظ

حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس ترمذی صاحب زید مجدہم
رئیس وشیخ الحدیث جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

بعد الحمد والصلاۃ! گزارش آنکہ آج سے ایک سو پندرہ سال قبل حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے اصولِ اسلام پر جدید تعلیم سے متاثر حضرات نے جو شبہات پیش کیے تھے حضرت نے ان کے اصولی اور شافی جوابات ''الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ'' کے نام سے تحریر فرما کر شائع کرادیے تھے جس سے بہت سے تشکیک زدہ حضرات کے شکوک کا ازالہ ہوا۔ حضرت کے اس رسالہ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک صدی قبل جتنی اس کی ضرورت تھی آج اس سے بھی کہیں زیادہ اس کی ضرورت ہے۔ اہلِ علم نے اس کی شروحات لکھیں اور عربی زبان کے قالب میں اسے ڈھالا۔ دینی مدارس کے نصاب میں باقاعدہ اسے پڑھایا جاتا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ رسالہ بلاشبہ ''بقامتِ کہتر بقیمت بہتر'' کا مصداق ہے۔ گو حضرت حکیم محمد مصطفیٰ رحمہ اللہ نے ''حل الانتباہات'' کے نام سے اس کی مفصل ومبسوط شرح تحریر فرمادی ہے جو محققانہ (تحقیقی) اور تفصیلی شرح ہے جس سے حضرت حکیم صاحب رحمہ اللہ کی معقول ومنقول میں جامعیت واضح ہے۔ بلکہ حضرت شیخ الاسلام مولانا علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں ''حل الانتباہات'' کو دیکھ کر ان کی علمیت کا قائل ہوگیا ہوں۔ لیکن حضرت کی یہ شرح بہت طویل ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ''الانتباہات'' کی مختصر شرح لکھی جائے یا اس کی تسہیل کردی جائے۔ پہلی خدمت جناب حکیم فخر الاسلام زید مجدہم نے اور دوسری خدمت عزیزم مفتی محمد طلحہ صادق سلمہٗ نے انجام دی۔ انتباہات کی تسہیل کئی مقامات سے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مسہل نے اصل متن کی تسہیل کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ اللہ ان کی اس کاوش کو قبول، نافع، مفید بلکہ افید بنائیں اور انہیں جزائے خیر دیں۔ آمین۔ فقط!

عبدالقدوس ترمذی غفرلہ

جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

۳ رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ/ ۱۴ مارچ ۲۰۲۴ء

تقریظ

حضرت مولانا قاری محمد صادق صاحب حفظہ اللہ ورعاہ

شیخ الحدیث جامعۃ الصابر، جامع العلوم قدسیہ وجامعہ نظامیہ بہاولپور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ امابعد!

”الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ“ حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا نہایت اہم رسالہ ہے۔ اس رسالہ میں حضرت قدس سرہٗ نے ان اعتراضات کے اصولی اور تسلی بخش جوابات دیے ہیں جو اسلامی عقائد پر جدید تعلیم سے متاثر حضرات کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر یہ رسالہ وفاق المدارس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ متعدد علماء کرام نے مختلف زاویوں سے اس رسالے کی خدمت کی ہے۔ زیرِ نظر کتابچے میں بندہ کے فرزند مفتی محمد طلحہ صادق سلمہٗ نے بڑی محنت سے اس رسالے کی تسہیل کا کام کیا ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبولیتِ تامہ اور مقبولیتِ عامہ نصیب فرمائے، مؤلف کے لئے ذخیرۂ آخرت اور تمام لوگوں کے لئے فائدہ مند بنائے۔ آمین

محمد صادق

مرکز عثمان وعلی بہاولپور

١٠ ذی قعدہ ١٤٤٥ھ/ ١٩ مئی ٢٠٢٤ء

❀...❀...❀

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ وحدہٗ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ۔ اما بعد!

اس کتابچے میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے انتہائی مفید رسالے ''الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ'' کو آسان بنانے کے لئے درج ذیل کام کئے گئے ہیں:

(۱) عربی، فارسی وغیرہ الفاظ کا اردو میں ترجمہ۔

(۲) مشکل الفاظ کا آسان الفاظ سے تبادلہ۔

(۳) اصطلاحی الفاظ کی عام زبان میں ترجمانی۔

(۴) پیچیدہ جملوں کی جگہ سادہ جملوں کا استعمال۔

(۵) کہیں کہیں ضرورت کے پیش نظر حذف واضافہ وترمیم۔

(۶) مثالوں میں پرانی چیزوں کو ہٹا کر نئی چیزوں کے ذریعے وضاحت۔

(۷) آیات واحادیث کے حوالہ جات کی تخریج وتصحیح۔

(۸) عنوانات کا اضافہ۔

بندہ کی پوری کوشش رہی ہے کہ اس رسالے کو جتنا ہوسکے آسان سے آسان تر کیا جائے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھایا جاسکے۔ خدا جانے بندہ اس جدوجہد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ بہرحال! اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس چھوٹی سی کاوش کو قبول فرما کر مقبولیتِ عامہ عطاء فرمائیں اور بندہ سمیت پوری امت کے لئے نفع بخش بنائیں۔ آمین یارب العالمین۔

محمد طلحہ صادق

فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

متخصص جامعہ اشرفیہ لاہور

۱۳ رجب ۱۴۴۵ھ/ ۲۵ جنوری ۲۰۲۴ء

❋...❋...❋

تعارف

حمداً وسلاماً بالغین سابغین !اس زمانے کے بعض مسلمانوں میں عقائد کی غلطیاں اور پھر ان سے اعمال کی جو غلطیاں پیدا ہوگئی ہیں اور مزید بڑھتی جارہی ہیں ان کی وجہ سے اکثر لوگ یہ مطالبہ کررہے ہیں کہ جدید علمِ کلام مرتب ہونا چاہئے۔

اگر قدیم علمِ کلام کے اصولوں کو دیکھا جائے تو یہ مطالبہ درست نہیں لگتا کیونکہ وہ اصول قدیم اور جدید دونوں قسم کے شبہات کو حل کرنے کے لئے کافی شافی ہیں۔ چنانچہ ان کو استعمال کرتے وقت اہلِ علم کو اس بات کا مکمل اندازہ بلکہ یقین ہوجاتا ہے۔ اور اگر شبہات کو دیکھا جائے تو یہ مطالبہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ آج کل کے جدید شبہات قدیم علمِ کلام میں نہیں پائے جاتے اگرچہ ان کو حل کرنے والے اصول موجود ہیں۔ مگر یہ جدید علمِ کلام جدید شبہات کے لحاظ سے ہوا نہ کہ اصول کے لحاظ سے۔ اس سے قدیم علمِ کلام کی جامعیت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے کہ شبہات چاہے کیسے ہی ہوں اور کسی بھی زمانے کے ہوں ان کے حل کے لئے قدیم علمِ کلام کے اصول کافی ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ایک تو اس بات کی اصلاح ضروری ہے۔

دوسری بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے، وہ یہ کہ اس بات سے اکثر لوگوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عقائد واعمال جو جمہور کے درمیان اتفاقی ہیں اور قرآنی آیات واحادیث کے ظاہر سے ہی ثابت ہیں اور سلفِ صالحین سے منقول ہیں، ان میں جدید علمِ کلام کے ذریعہ ایسا ردوبدل کیا جائے کہ یہ عقائد واعمال جدید تحقیقات پر فٹ آجائیں، چاہے یہ تحقیقات مشاہدہ اور قطعی عقلی دلیل کے سراسر خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد غلط ہے۔

نیز جن دعووں کا نام جدید تحقیقات رکھا گیا ہے نہ وہ سب تحقیق کے معیار کو پہنچتے ہیں بلکہ ان میں سے اکثر وہم اور نرے اندازے ہیں، اور نہ ان میں سے اکثر جدید ہیں بلکہ قدیم فلاسفہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ہمارے متکلمین نے ان پر بحث بھی کی ہے۔ چنانچہ علم کلام کی کتابیں دیکھنے سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں ہے کہ بعض شبہات جن کا تذکرہ ختم ہوگیا تھا ان کا تذکرہ اب دوبارہ ہونے لگا ہے۔ بعض کو جدید عنوان دے دیا گیا ہے اور بعض واقعی جدید شبہات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس لحاظ سے شبہات کے اس مجموعہ کو جدید کہنا مناسب ہے اور ان کے جوابات کو اس لئے کہ وہ جدید شبہات کے مقابلے میں ہیں اور اس لئے بھی کہ اہلِ زمانہ کے مزاج کے لحاظ سے اندازِ گفتگو میں

جدت مفید ثابت ہوتی ہے جدید علمِ کلام کہنا صحیح ہے، اور اس لحاظ سے جدید علمِ کلام کی ضرورت سے انکار کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

بہرحال جس اعتبار سے بھی یہ ضروری ہوا ایک عرصہ سے اس ضرورت کو پورا کرنے کی مختلف صورتیں ذہن میں آرہی تھیں۔ ان میں سے بعض صورتیں اگرچہ مکمل تھیں مگر ساتھ لمبی بھی تھیں۔ اس لئے اکثر ذہن اس مختصر صورت کو قبول کرتا تھا کہ جتنے شبہات اس وقت زبان یا قلم کے ذریعہ سامنے آرہے ہیں ان سب کو جمع کرکے ایک ایک کا علیحدہ علیحدہ جواب دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ طریقہ موجودہ شبہات کو دور کرنے کے لئے زیادہ فائدہ مند بھی ہوگا اور ان جزئیات کے ذریعے جو اصول حاصل ہوں گے وہ آئندہ پیش آنے والے ان جیسے دوسرے شبہات کو دور کرنے کے لئے بھی کافی ہوں گے۔

چونکہ اس سلسلے میں شبہات کو جمع کرنے کی ضرورت تھی اور یہ کام صرف جواب دینے والے کا نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس بارے میں کئی ساتھیوں سے مدد طلب کی اور اس انتظار میں رہا کہ شبہات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو جائے تو خدا کا نام لے کر اس کام کو شروع کیا جائے۔

ابھی اسی انتظار میں تھا کہ اس دوران احقر کو ذی قعدہ ۱۳۲۷ھ بمطابق نومبر ۱۹۰۹ء کے شروع میں بنگال کا سفر پیش آگیا۔ راستے میں اپنے چھوٹے بھائی سے ملنے کے لئے علی گڑھ اترا (جو وہاں سب انسپکٹر ہیں) تو کالج کے بعض طلبہ کو پتہ چل گیا۔ چنانچہ وہ ملنے آئے اور ان میں سے کچھ حضرات نے سیکرٹری صاحب یعنی جناب نواب وقارالامراء کو بھی بتادیا اور شاید درخواست بھی کی کہ بیان کی سفارش کی جائے۔ چنانچہ رات کو جناب نواب صاحب کا اسی بات کا رقعہ پہنچا۔

صبح کو آپ خود تشریف لائے اور اپنے ساتھ کالج لے گئے۔ جمعہ کا دن تھا، نماز ادھر ہی پڑھی اور فرمائش کے مطابق عصر تک کچھ بیان بھی کیا۔ جس کا خلاصہ آگے "تمہید" کے تحت آرہا ہے۔ کالج کے طلبہ کی بیان سننے کی حالت سے اندازہ ہوا کہ ان میں ایک حد تک حق کی طلب اور چاہت بھی ہے اور سمجھداری اور انصاف پسندی بھی۔ چنانچہ آئندہ بھی وقتاً فوقتاً اصلاحی بیان سنانے کی خواہش کی جسے احقر نے دینی خدمت سمجھ کر خوشی سے قبول کرلیا۔

اس حالت کو دیکھ کر اور اختصار کے پیشِ نظر یہ تجویز ذہن میں آئی کہ شبہات کے جمع ہونے کا انتظار فی الحال چھوڑ دیا جائے۔ اور جو شبہات اب تک سننے میں آئے ہیں یا کتابوں میں پڑھے ہیں صرف ان کے ضروری جوابات اپنے بیان میں طلبہ کے سامنے پیش کردیئے جائیں اور باقی لوگوں کے فائدہ کے

لئے ان کو مختصر طور پر لکھ کر شائع کر دیا جائے چاہے تقریر پہلے ہو اور تحریر بعد میں یا اس کے برعکس ہو وقت اور حالات کے مطابق۔ اور اگر اس دوران بعض حضرات شبہات جمع کرنے میں مدد کریں تو مختصر طور پر جیسے کہ پیچھے ذکر کیا گیا ہے ان کا بھی جواب دے دیا جائے اور ان کو اس رسالہ کا دوسرا حصہ بنا دیا جائے، ورنہ ان شاء اللہ اس ابتدائی رسالہ کے بھی کافی ہونے کی امید ہے اور اگر کوئی اس رسالہ کو سبقاً پڑھانے والا مل جائے تو اور بھی زیادہ فائدہ ہوگا۔

اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے اور وہ ملحدین ومعترضین کی کتابوں میں جو شبہات اسلام پر سائنس یا خود بنائے ہوئے تمدنی قواعد سے اختلاف کی بناء پر کئے گئے ہیں انہیں جمع کر کے تفصیلی جوابات کتاب کی شکل میں تحریر کر دے تو ایسی کتاب ''جدید علمِ کلام'' کا صحیح مصداق ہوگی۔ اس کا ایک جامع نمونہ فاضل طرابلسی کا ''رسالہ حمیدیہ'' ہے، جو کہ الحمدللہ چھپ چکا ہے اور اس کا ترجمہ ''سائنس واسلام'' کے نام سے ہندوستان میں شائع ہو چکا ہے اور اکثر لوگوں کے لئے مفید ثابت ہوا ہے۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ وَبِيَدِهٖ اَزِمَّةُ التَّحْقِيْقِ اَللّٰهُمَّ يَسِّرْ لَنَا هٰذَا الطَّرِيْقَ وَاجْعَلْ عَوْنَكَ لَنَا خَيْرَ رَفِيْقٍ

❀...❀...❀

تمہید

سورۃ لقمان کی آیت کا ایک حصہ ﴿وَ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ﴾ [لقمان، آیت:۱۵] ترجمہ: ''اور ایسے شخص کا راستہ اپناؤ جس نے مجھ سے لو لگا رکھی ہو'' پڑھ کر تفصیلی بیان کیا گیا تھا۔ اس کا خلاصہ لکھا جاتا ہے۔

آج کسی خاص موضوع پر بیان کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ مقصد مختصر طور پر ان اسباب کو بیان کرنا ہے جن کی وجہ سے آج تک علماء کے بیان آپ کے لئے کم مفید ثابت ہوئے ہوں گے اور اگر نشاندہی کرنے کے بعد بھی ان کی تلافی نہ کی گئی تو آئندہ کے بیان بھی اگر ہوئے تو اسی طرح غیر مفید ہوں گے۔ ان اسباب کا خلاصہ چند کوتاہیاں ہیں۔

کوتاہی ①

پہلی کوتاہی یہ ہے کہ شبہات جو کہ روحانی بیماریاں ہیں ان کو بیماری نہیں سمجھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ

ان کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جاتا جو جسمانی بیماریوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

دیکھیے! خدانخواستہ اگر کبھی کوئی بیماری ہوئی ہوگی تو یہ انتظار کبھی نہیں کیا ہوگا کہ کالج میں جو ڈاکٹر موجود ہے وہ خود ہمارے کمرے میں آ کر ہماری نبض چیک کرے اور علاج کرے بلکہ خود اس کے کلینک پہ جا کے اسے چیک کرایا ہوگا اور اگر اس کے علاج سے افاقہ نہیں ہوا ہوگا تو کالج سے باہر شہر کے سول سرجن کے پاس ہسپتال گئے ہوں گے اور اگر اس سے بھی فائدہ نہیں ہوا ہوگا تو شہر چھوڑ کر دوسرے شہروں کا سفر کیا ہوگا اور سفر، ڈاکٹر کی فیس اور ادویات کی مد میں کافی پیسے خرچ بھی کئے ہوں گے۔ غرض ٹھیک ہونے تک چین سے نہیں بیٹھے ہوں گے۔

پھر ان شبہات کے سلسلے میں کیوں اس بات کا انتظار کیا جاتا ہے کہ علماء خود ہماری طرف متوجہ ہوں۔ آپ خود ان سے رابطہ کیوں نہیں کرتے؟ اگر ایک عالم سے رابطہ کرنے کے بعد ان کے جواب سے آپ کو تسلی نہیں ہوتی یا ان کا جواب آپ کے مزاج کے مطابق نہیں ہے تو دوسرے علماء سے رابطہ کیوں نہیں کرتے؟ یہ کیسے سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوگا؟ تحقیق کر کے تو دیکھنا چاہیے۔ حالانکہ جسمانی علاج پر جتنا خرچہ ہوتا ہے یہاں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک کاغذ پر سوال لکھ کر جس عالم سے چاہو جو چاہو پوچھ سکتے ہو۔

کوتاہی (۲)

دوسری کوتاہی یہ ہے کہ اپنی سمجھ اور رائے پر مکمل اعتماد کر لیا جاتا ہے کہ ہمارے خیال میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ بھی رابطہ نہ کرنے کی ایک وجہ ہے اور یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اگر اپنے خیالات کے بارے میں علماء سے پوچھ لیا جائے تو اسی وقت اپنی غلطیاں معلوم ہو جائیں۔

کوتاہی (۳)

تیسری کوتاہی یہ ہے کہ پیروی کی عادت کم ہے اسی لئے کسی کام میں ماہرین کی پیروی نہیں کرتے، ہر چیز میں دلائل اور اسرار و رموز تلاش کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ عام آدمی کے لئے ماہر کی پیروی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ علماء کرام کے پاس دلائل نہیں ہیں۔ دلائل بہت ہیں مگر بہت سی باتیں ہر ایک کے لئے سمجھنا آسان نہیں ہیں جیسے جیومیٹری کی کوئی شکل کسی ایسے شخص کو سمجھانا جو ریاضی سے بالکل ناواقف ہو بہت مشکل ہے۔ اسی طرح شریعت کو سمجھنے کے لئے کچھ علوم بنیاد اور واسطہ ہیں۔ تحقیق کرنے والے کے لئے ان علوم کو حاصل کرنا ضروری ہے اور جو شخص ان علوم کو حاصل نہ کر سکے اس کے

لئے تقلید کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ لہٰذا آپ حضرات اپنا دستور یہ بنائیں کہ جو شبہ پیش آئے اس کے حل ہونے تک مسلسل علماء کے سامنے اسے پیش کرتے رہیں اور اپنی رائے پر اعتماد نہ کریں اور جو بات مکمل طور پر سمجھ میں نہ آئے اس میں اپنے اندر کی سمجھ کر ماہر علماء پر بھروسہ اور ان کی پیروی کریں۔ ان شاء اللہ بہت جلد پوری اصلاح ہو جائے گی۔

❀...❀...❀

حکمت کی تعریف اور اقسام

حکمت کی تعریف

حکمت جسے فلسفہ بھی کہتے ہیں ایک ایسا عام مفہوم ہے جس سے کوئی علم باہر نہیں ہے۔ اس میں شریعت بھی داخل ہے۔ اسی لئے یہاں حکمت سے بحث کی جارہی ہے، کیونکہ حکمت کہتے ہیں: ''حقیقی موجودات کے حقیقی حالات کو اس طرح جاننا کہ اس سے کوئی قابلِ ذکر کمال بھی حاصل ہو۔'' تمام علوم میں موجودات میں سے کسی نہ کسی کے احوال ذکر کئے جاتے ہیں اس لئے تمام علوم حکمت کے تحت داخل ہیں۔

حکمت کی اقسام

حکمت کی اولاً دو قسمیں ہیں:

۱. جن موجودات سے بحث کی جاتی ہے یا تو وہ ایسے موجودات ہیں جن کا وجود ہمارے اختیار میں ہے، ان کے حالات جاننے کا نام ''حکمتِ عملیہ'' ہے۔
۲. یا ایسے موجودات ہیں جن کا وجود ہمارے اختیار میں نہیں ہے، ان کے حالات جاننے کا نام ''حکمتِ نظریہ'' ہے۔ پھر ان دو قسموں میں سے ہر ایک کی تین تین قسمیں ہیں۔

حکمتِ عملیہ کی اقسام

۱. حکمتِ عملیہ یا تو ایک ایک شخص کی مصلحتوں کا علم ہے، اسے ''تہذیبِ اخلاق'' کہتے ہیں۔
۲. یا ایسی جماعت کی مصلحتوں کا علم ہے جو ایک گھر میں رہتے ہیں، اسے ''تدبیرِ منزل'' کہتے ہیں۔
۳. یا ایسی جماعت کی مصلحتوں کا علم ہے جو ایک شہر یا ایک ملک میں رہتے ہیں، اسے ''سیاستِ مدنیہ'' کہتے ہیں۔

حکمتِ نظریہ کی اقسام

(۱) حکمتِ نظریہ یا تو ایسی چیزوں کے حالات کا علم ہے جو بالکل مادہ کی محتاج نہیں ہیں نہ حقیقت میں نہ ذہن میں، اسے ''علمِ الٰہی'' کہتے ہیں۔

(۲) یا ایسی چیزوں کے حالات کا علم ہے جو حقیقت میں مادہ کی محتاج ہیں مگر ذہن میں نہیں، اسے ''علمِ ریاضی'' کہتے ہیں۔

(۳) یا ایسی چیزوں کے حالات کا علم ہے جو حقیقت اور ذہن دونوں میں مادہ کے محتاج ہیں، اسے ''علمِ طبعی'' کہتے ہیں۔

حکمت کی کل اقسام

حکمت کی کل چھ قسمیں ہوئیں:

(۱) تہذیبِ اخلاق (۲) تدبیرِ منزل (۳) سیاستِ مدنیہ

(۴) علمِ الٰہی (۵) علمِ ریاضی (۶) علمِ طبعی

اگرچہ ان قسموں کی آگے اور بھی قسمیں ہیں مگر بنیادی قسمیں یہی چھ ہیں۔

شریعت کا مقصد

اب جاننا چاہیے کہ شریعت کا اصل مقصد خالق کے حقوق اور مخلوق کے حقوق کی ادائیگی کو اللہ تعالیٰ کی رضا کا ذریعہ بنانے کی تعلیم دینا ہے، اگرچہ دنیاوی مصلحتیں بھی ان سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور جہاں شریعت کا کوئی حکم دنیاوی مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا ہے یا تو وہاں جمہور کی مصلحت کو شخصی مصلحت پر مقدم کیا گیا ہے، یا اس دنیاوی مصلحت سے زیادہ اس میں روحانی نقصان تھا اسے دور کیا گیا ہے۔ بہر حال! اصل مقصد یہی اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، جبکہ علمِ ریاضی اور علمِ طبعی کو خالق کے حقوق یا مخلوق کے حقوق کی ادائیگی سے کوئی سروکار نہیں ہے اس لئے شریعت نے بطورِ مقصد ان سے کوئی بحث نہیں کی۔ اگر شریعت میں کہیں طبعیات وغیرہ کا کوئی مسئلہ آ گیا ہے تو علمِ الٰہی کے بعض مسائل پر دلیل قائم کرنے کے لئے بطورِ واسطہ کے آیا ہے چنانچہ اس کے ساتھ ﴿لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ [اٰل عمران، آیت: ۱۹۰] ترجمہ: ''نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔'' وغیرہ فرمانا اس کی واضح دلیل ہے۔

شریعت کے تحت آنے والی حکمت کی اقسام

اب ایک قسم حکمتِ نظریہ کی یعنی ''علمِ الٰہی'' اور حکمتِ عملیہ کی تینوں اقسام یعنی ''(۱) تہذیبِ اخلاق (۲) تدبیرِ منزل (۳) اور سیاستِ مدنیہ'' رہ گئیں۔ چونکہ ان سب کا شریعت کے مقصد یعنی ''حقوق

کی ادائیگی‘‘ سے تعلق ہے اس لئے شریعت نے ان سے کافی بحث کی ہے۔ حکمتِ عملیہ کے متعلق شرعی مباحث کے کامل اور مکمل ہونے کا اعتراف خود فلاسفہ کے پیروکاروں نے بھی ان الفاظ سے کیا ہے ’’اِنَّ الشَّرِیْعَةَ الْمُصْطَفَوِیَّةَ قَدْ قَضَتِ الْوَطَرَ عَلٰی اَکْمَلِ وَجْہٍ وَاَتَمِّ تَفْصِیْلٍ‘‘ ترجمہ: ’’اس میں کوئی شک نہیں کہ مصطفوی شریعت نے مکمل طور پر اور بھرپور طریقے سے (حکمتِ عملیہ) کی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔‘‘

علمِ الٰہی کے متعلق شرعی مباحث کے دلائل کا موازنہ کرنے سے بھی حکماء کو مجبوراً یہی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال! شریعت میں جس چیز سے بحث کی جاتی ہے وہ ایک ’’تو علمِ الٰہی‘‘ ہے، جس کے تحت وحی، نبوت اور قیامت کے احوال داخل ہیں اس کا نام علمِ عقائد ہے۔ اور دوسری ’’حکمتِ عملیہ‘‘ ہے، جس کی شریعت کے تحت آنے والی اقسام یہ ہیں: (۱) عبادات (۲) معاملات (۳) معاشرت (۴) اخلاق نیز یہ اقسام مشہور قسموں تہذیبِ اخلاق، تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدنیہ سے الگ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے میں داخل ہیں۔ تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔

شریعت کے پانچ علوم

غرض شریعت کے علوم پانچ ہیں: (۱) عبادات (۲) معاملات (۳) معاشرت (۴) اخلاق (۵) عقائد۔ ان پانچ علوم کے تمام مسائل سے بحث کرنا مقصد نہیں ہے، بلکہ مقصد ان علوم کی صرف ان باتوں سے بحث کرنا ہے جن میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کو کسی وجہ سے شبہ ہوگیا ہے، اور وہ شبہات چونکہ عقائد سے متعلق ہیں اس لئے سب مباحث سے مقصود عقائد سے بحث کرنا ہی ہے۔

رسالے کی ترتیب

اگرچہ ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ ایک قسم کے تمام مسائل سے فارغ ہو کر دوسری قسم کو شروع کیا جاتا مگر قارئین کو تازہ دم اور ہشاش بشاش رکھنے کے پیش نظر بلا ترتیب گفتگو کرنا زیادہ مناسب لگا۔ چنانچہ آگے ان شاء اللہ اسی طرح اپنی گزارشات پیش کروں گا۔ ان گزارشات کا نام انتباہات رکھتا ہوں اور یہی ’’تنبیہات‘‘ اس رسالہ کے مقاصد ہیں۔ پہلے کچھ قواعد کو جو ان مقاصد کے لئے ’’اصول‘‘ کا درجہ رکھتے ہیں بیان کیا جاتا ہے۔ اور مقاصد میں مختلف مقامات پر ان قواعد کا حوالہ دیا جائے گا تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔ فقط

(حضرت مولانا) اشرف علی عفی عنہ
مقام تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

اصول نمبر ۱

کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

تشریح

کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہاں اگر کسی دلیل کے ذریعے یہ معلوم ہوجائے کہ فلاں چیز کا کوئی وجود نہیں ہے تب اسے باطل کہا جائے گا۔

یعنی یہ دو الگ الگ باتیں ہیں: ۱ کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا۔ ۲ کسی دلیل کے ذریعے یہ معلوم ہونا کہ فلاں چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔

پہلی بات کا مطلب

''کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو پہلے کبھی نہ دیکھنے کی وجہ سے ذہن اس چیز کو فوراً قبول نہیں کرسکا۔ اس لئے اس چیز کے ہونے میں حیرت یا شک ہے لیکن سوائے اس کے کہ یہ کہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ اس کی نفی پر کوئی صحیح دلیل عقلی یا نقلی قائم نہیں کرسکتا۔

مثال ۱

جیسے کسی دیہاتی نے جسے کبھی روبوٹ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا یہ سنا کہ روبوٹ کے نام سے ایسے مشینی انسان آچکے ہیں جو حقیقی انسان کی طرح کام کرتے ہیں۔ تو وہ تعجب سے کہے گا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ روبوٹ انسان کی طرح کام نہیں کرسکتے۔ اسے کہتے ہیں سمجھ میں نہ آنا۔ اور اگر وہ صرف اسی وجہ سے نفی کرنے لگے اور مخاطب کو جھٹلانے لگے تو عقلاً اس کو بے وقوف سمجھیں گے اور اس کی وجہ یہ ہوگی کہ تمہاری سمجھ میں نہ آنے سے نفی کیسے لازم آئی؟

مثال ۲

اسی طرح اگر کسی نے سنا کہ قیامت کے دن پل صراط پر چلنا ہوگا اور وہ بال سے باریک ہوگا چونکہ کبھی ایسا ہوتا دیکھا نہیں اس لئے یہ تعجب ہونا کہ کیسے ہوگا؟ بجا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کی نفی پر بھی عقل کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ سرسری نظر میں اگر کوئی دلیل ہوسکتی ہے تو وہ یہ کہ قدم تو اتنا چوڑا

اور قدم رکھنے کی چیز اتنی کم چوڑی، اس پر پاؤں کا ٹکنا اور چلنا ممکن نہیں ہے، لیکن خود اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ پائیدان کی چوڑائی قدم سے زیادہ ہونا عقلاً ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عادتاً ایسا ہی دیکھا ہو اس کے خلاف نہ دیکھا ہو یا دیکھا تو ہو مگر اتنا زیادہ فرق نہ دیکھا ہو جیسے بعض لوگوں کو رسی پر چلتے دیکھا ہو۔ مگر اس میں کیا مشکل ہے کہ وہاں عادت بدل دی جائے اس لئے اگر کوئی اس بات کو جھٹلائے گا تو وہ اس شخص کی طرح ہوگا جس نے روبوٹ کے انسان کی طرح کام کرنے کو جھٹلایا تھا۔

دوسری بات کا مطلب

''کسی دلیل کے ذریعے یہ معلوم ہونا کہ فلاں چیز کا کوئی وجود نہیں ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کی نفی پر کوئی صحیح دلیل عقلی یا نقلی موجود ہو۔

مثال ۱

جیسے کوئی شخص کراچی سے ریل میں سوار ہو کر بہاولپور اترا اور ایک شخص نے اس کے سامنے کہا کہ یہ ریل کراچی سے بہاولپور تک ایک گھنٹے میں آئی ہے (جبکہ حقیقت میں کم از کم گیارہ گھنٹے لگتے ہیں) تو وہ مسافر اس کو جھٹلائے گا اور اس کے پاس اس کی نفی کی دلیل موجود ہے یعنی خود اپنا مشاہدہ اور دوسرے مسافر جو اس گاڑی سے اترے ہیں ان کی گواہی۔

مثال ۲

کسی نے یہ سنا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فلاں بزرگ کی اولاد کو اگر چہ وہ مسلمان بھی نہ ہو تب بھی اس بزرگ سے رشتہ داری کی وجہ سے مغفرت فرما کر اپنا خصوصی قرب عطاء فرمائے گا تو چونکہ اس کے خلاف دلیل موجود ہے یعنی ایسی آیات واحادیث موجود ہیں جن میں کافر کی بخشش نہ ہونے کا ذکر ہے، جیسے کہ آیتِ مبارکہ ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ○﴾ [محمد، آیت: ۳۴] ترجمہ: ''بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور اللہ کے راستے سے روکتے رہے پھر کفر کی حالت میں مر گئے تو اللہ ہر گز انہیں نہیں بخشے گا۔'' اس لئے اس بات کی نفی کی جائے گی اور اس کو باطل کہا جائے گا۔ یہ ہے فرق ''سمجھ میں نہ آنے'' اور ''باطل ہونے'' میں۔

❁...❁...❁

اصول نمبر ۲

جب کوئی چیز عقلاً ممکن ہو اور صحیح نقلی دلیل اس کے موجود ہونے پر قائم ہو جائے تو اس کے وجود کو ماننا ضروری ہے۔ اور اگر نقلی دلیل اس کے موجود نہ ہونے پر قائم ہو جائے تو اس کے عدمِ وجود کو ماننا ضروری ہے۔

تشریح

تمام چیزیں تین قسم پر ہیں۔

۱. بعض چیزیں وہ ہیں جن کے ہونے کو عقل ضروری قرار دیتی ہے۔ مثلاً ایک دو کا آدھا ہے۔ یہ بات ایسی لازمی ہے کہ ایک اور دو کا معنیٰ جاننے کے بعد عقل اس کے ہونے کو ضروری قرار دیتی ہے اور اس کے خلاف کو بالکل غلط سمجھتی ہے۔ اسے ''واجب'' کہتے ہیں۔

۲. بعض چیزیں وہ ہیں جن کے نہ ہونے کو عقل ضروری قرار دیتی ہے۔ مثلاً ایک دو کے برابر ہے۔ یہ بات ایسی ناممکن ہے کہ عقل اس کے نہ ہونے کو ضروری قرار دیتی ہے اور اس کو یقینی طور پر غلط سمجھتی ہے۔ اسے ''ممتنع اور محال'' کہتے ہیں۔

۳. بعض چیزیں وہ ہیں جن کے نہ تو ہونے کو عقل لازمی قرار دیتی ہے اور نہ ہی نہ ہونے کو بلکہ دونوں کو ممکن قرار دیتی ہے اور ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کسی دلیلِ نقلی پر چھوڑ دیتی ہے۔ مثلاً فلاں شہر کا رقبہ فلاں شہر سے زیادہ ہے۔ یہ زیادہ ہونا ایسی چیز ہے کہ پیمائش کرنے سے پہلے یا پیمائش کرنے والوں کی بات ماننے سے پہلے عقل نہ اس کے صحیح ہونے کو ضروری قرار دیتی ہے نہ اس کے باطل ہونے کو بلکہ اس کے نزدیک دونوں امکان ہیں کہ یہ بات صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ اسے ''ممکن'' کہتے ہیں۔

ایسی ممکن چیز کا ہونا اگر صحیح نقلی دلیل سے ثابت ہو جائے تو اس کے وجود کو ماننا ضروری ہے۔ اور اگر اس کا نہ ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے عدمِ وجود کو ماننا ضروری ہے۔ مثلاً اوپر والی مثال میں پیمائش کے بعد کہیں اسے صحیح کہیں گے اور کہیں غلط۔

اسی طرح اوپر سات ٹھوس آسمانوں کا ہونا عقلاً ممکن ہے۔ یعنی عقل کے پاس نہ ان کے ہونے کی کوئی دلیل ہے اور نہ ان کے نہ ہونے کی۔ عقل کے نزدیک دونوں امکان ہیں۔ اس لئے عقل کو ان کے ہونے یا نہ ہونے کو ثابت کرنے کے لئے نقلی دلیل کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اور نقلی دلیل یعنی قرآنی

آیات اور احادیث ان کے ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔اس لئے ان کے وجود کو ماننا ضروری ہے۔

اعتراض

فیثا غورث نے تمام سیاروں کی حرکتوں اور پوری کائنات کے نظام کا ایسا حساب بنا کر دکھایا ہے کہ اس کے مطابق آسمان کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کا وجود نہیں ہے۔

جواب

فیثا غورثی حساب کو آسمان کے نہ ہونے کی دلیلِ نقلی سمجھنا محض لاعلمی ہے، کیونکہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حساب کی درستگی آسمانوں کے وجود یا حرکت پر موقوف نہیں ہے۔اور کسی چیز کا کسی چیز پر موقوف نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، جیسے شہر کے کسی کام کا تحصیلدار پر موقوف نہ ہونا شہر میں تحصیلدار کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

❋...❋...❋

اصول نمبر ۳

عقلاً محال ہونا اور چیز ہے اور عجیب ہونا اور چیز ہے، محال خلافِ عقل ہوتا ہے اور عجیب خلافِ عادت۔عقل کے احکام الگ ہیں اور عادت کے الگ، دونوں کے احکام کو ایک جیسا سمجھنا غلط ہے، محال کبھی ہو نہیں سکتا جبکہ عجیب ہو سکتا ہے۔محال کو خلافِ عقل کہیں گے اور عجیب کو خلافِ عادت، ان دونوں کو ایک سمجھنا غلط ہے۔

تشریح

پہلے چند اصلاحات کو سمجھ لینا چاہئے۔

محال کی تعریف

محال وہ ہے جس کے نہ ہونے کو عقل ضروری قرار دے، اسے ممتنع بھی کہتے ہیں۔جیسے ایک دو کے برابر ہے۔

محال کا حکم

محال کو صرف محال ہونے کی وجہ سے جھٹلانا ضروری ہے، جیسے اگر کوئی کہے ایک دو کے برابر ہے تو اس کو جھٹلانا ضروری ہے۔

عجیب کی تعریف

عجیب وہ ہے جس کے ہونے کو عقل ممکن قرار دے مگر چونکہ اس کو ہوتے ہوئے کبھی دیکھا نہیں اور دیکھنے والوں سے زیادہ سنا نہیں، اس لئے اس کے ہونے کا سن کر پہلے پہل حیرت ہوتی ہے، جیسے روبوٹ کا انسان کی طرح کام کرنا۔

عجیب کا حکم

عجیب کو صرف عجیب ہونے کی وجہ سے جھٹلانا جائز نہیں ہے، البتہ اگر عجیب ہونے کے علاوہ اس کے جھوٹے ہونے پر کوئی صحیح دلائل بھی موجود ہوں تو جھٹلانا نا صرف جائز بلکہ ضروری ہے، جیسے اگر کوئی کہے کہ ایسے روبوٹ آچکے ہیں جو انسان کی طرح کام کرتے ہیں تو اس کو جھٹلانا جائز نہیں، اگرچہ ایسے شخص کے نزدیک جس نے روبوٹ کو کبھی نہ دیکھا ہو یہ بات عجیب ہے۔ بلکہ جن چیزوں کو معمول کے مطابق سمجھا جاتا ہے وہ حقیقت میں سب عجیب ہیں مگر بار بار دیکھنے، مانوس ہونے اور عادی ہو جانے کی وجہ سے وہ عجیب نہیں لگتیں، مثلاً روبوٹ کا اس طرح کام کرنا اور مٹی سے طرح طرح کے ذائقوں اور رنگوں والی سبزیوں کا اگنا، ان دونوں میں عجیب ہونے کے لحاظ سے کیا فرق ہے؟ بلکہ حقیقت میں دوسری بات زیادہ عجیب ہے، مگر جس دیہاتی نے روبوٹ کبھی نہ دیکھا ہو اور مٹی سے سبزیاں اگتے ہوش سنبھالتے ہی دیکھتا چلا آرہا ہو تو وہ ضرور پہلے کو عجیب سمجھے گا اور دوسرے کو اگرچہ وہ پہلے سے زیادہ عجیب ہے، عجیب نہیں سمجھے گا۔

اسی طرح جس شخص نے کمپیوٹر کو ہمیشہ باتیں کرتے دیکھا مگر ہاتھ پاؤں کو باتیں کرتے نہیں دیکھا تو وہ کمپیوٹر کے اس عمل کو عجیب نہیں سمجھتا مگر ہاتھ پاؤں کے اس عمل کو عجیب سمجھتا ہے۔ عجیب سمجھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن یہ سخت غلطی ہے کہ عجیب کو محال سمجھے اور محال سمجھ کر قرآن وحدیث کو جھٹلائے یا بلاضرورت ان میں تاویلیں کرے۔

غرض صرف عجیب ہونے کی بناء پر اس پر محال کے احکام جاری کرنا بہت بڑی غلطی ہے، البتہ اگر عجیب ہونے کے علاوہ کوئی صحیح دلیل اس کے موجود نہ ہونے پر قائم ہو تو اس وقت اس کی نفی کرنا ضروری ہے، جیسے کراچی سے بہاولپور تک ایک گھنٹے میں ریل پہنچنے کی مثال میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور اگر صحیح دلیل اس کے موجود ہونے پر قائم ہو اور موجود نہ ہونے پر اس درجے کی دلیل نہ ہو تو اس وقت اس کے موجود ہونے کو ماننا ضروری ہوگا، مثلاً جب تک فون عام نہیں ہوا تھا اس وقت اگر کوئی شخص یہ

کہتا کہ میں نے خود فلاں شخص سے فون پر بات کی ہے جو سینکڑوں کلومیٹر دور دوسرے شہر میں رہتا ہے تو اگر اس خبر دینے والے کا بالکل سچا ہونا پہلے سے ثابت نہ ہوتا تو بھی اگرچہ اسے جھٹلانے کی حقیقتاً گنجائش نہیں تھی مگر بظاہر کچھ گنجائش ہوسکتی تھی، لیکن اگر اس کا بالکل سچا ہونا پہلے سے ثابت ہوتا تو اسے جھٹلانے کی گنجائش بالکل نہیں تھی، یہ ہیں محال اور عجیب کے الگ الگ احکام۔

اسی طرح بال سے باریک پل صراط پر سے مخلوق کا گزرنا چونکہ محال نہیں ہے صرف عجیب ہے اور اس کے ہونے کی خبر سچے شخص نے دی ہے، اس لئے اس کی نفی کرنا یا جھٹلانا سخت غلطی ہے اور اس میں تاویل کرنا ایک فضول حرکت ہے۔

❀...❀...❀

اصول نمبر ۴

کسی چیز کے موجود ہونے کے لئے اس کا محسوس ہونا اور نظر آنا ضروری نہیں ہے۔

تشریح

کسی چیز کے موجود ہونے کا علم تین طریقوں سے ہوسکتا ہے:

۱. مشاہدہ یعنی خود دیکھنا: جیسے ہم نے زاہد کو آتے ہوئے خود دیکھا۔
۲. سچے شخص کی خبر: جیسے کسی معتبر آدمی نے بتایا کہ زاہد آیا تھا۔ اسے دلیلِ نقلی کہتے ہیں۔

اس میں شرط یہ ہے کہ کوئی زیادہ قوی دلیل اس کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً کسی نے بتایا کہ زاہد رات آیا تھا اور آتے ہی تمہیں چاقو سے زخمی کیا تھا، حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں کسی نے زخمی نہیں کیا اور نہ اب تم زخمی ہو۔ یہاں مشاہدہ اس کے خلاف ہے اس لئے اس خبر کو غلط کہیں گے۔

۳. عقل: جیسے دھوپ کو دیکھ کر عقل کے ذریعے پہچان لیا کہ سورج طلوع ہوگیا ہے اگرچہ سورج کو نہ دیکھا ہو اور نہ کسی نے اس کے طلوع ہونے کی خبر دی ہو۔ اسے دلیلِ عقلی کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی چیز کی موجود ہونے کا علم صرف دیکھنے کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ سچے شخص کی خبر اور عقل کے ذریعے بھی ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو موجود کہا جائے وہ محسوس بھی ہو اور نظر بھی آئے اور جو محسوس نہ ہو یا نظر نہ آئے اسے غیر موجود کہا جائے، مثلاً قرآن وحدیث نے بتایا ہے کہ ہمارے اوپر سات بڑے بڑے اجسام موجود ہیں جنہیں آسمان کہتے ہیں۔ [المؤمنون، آیت: ۱۷]

اب اگراس نیلگوں خلا کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے وہ ہمیں نظر نہ آتے ہوں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صرف نظر نہ آنے کی وجہ سے ان کی نفی کردی جائے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ موجود ہوں اور کسی وجہ سے ہمیں نظر نہ آتے ہوں اور چونکہ سچے شخص نے ان کے موجود ہونے کی خبر دی ہے اس لئے ان کے وجود کو ماننا ضروری ہے۔

❁...❁...❁

اصول نمبر ۵

محض نقل شدہ چیزوں پر عقلی دلیل قائم کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے اس کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے۔

تشریح

محض نقل شدہ چیزوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا وجود کسی سچے شخص کی خبر کے ذریعے معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں پر عقلی دلیل قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔

مثال ۱

کوئی شخص کہے کہ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکا تھا جس سے تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار لوگ ہلاک ہوگئے تھے، اس پر کوئی شخص کہے کہ اس کی کوئی عقلی دلیل پیش کرو، تو ظاہر ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا فلسفی کیوں نہ ہو سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہے کہ کسی ایٹمی ملک کا کسی دوسرے ملک پر ایٹم بم پھینکنا کوئی محال چیز تو ہے نہیں بلکہ ممکن ہے، اور اس ممکن کے ہونے کی خبر معتبر مؤرخین نے دی ہے اور جس ممکن کے ہونے کی خبر کوئی سچا شخص دے اس کے وجود کو ماننا ضروری ہوتا ہے اس لئے اس واقعے کو ماننا ضروری ہے۔

مثال ۲

اسی طرح قیامت کا آنا، سب مردوں کا زندہ ہونا اور نئی زندگی کا دور شروع ہونا محض نقل شدہ چیزیں ہیں، اس لئے کوئی شخص ان چیزں پر عقلی دلیل کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان چیزوں کا عقلاً محال ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے اگرچہ یہ چیزیں سمجھ میں نہ آئیں، اور سمجھ میں نہ آنا اور عقلاً محال ہونا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن ٹھہرے اور ان ممکنات کے واقع ہونے کی خبر

ایسے شخص نے دی ہے جس کی سچائی دلائل سے ثابت ہے، اس لئے ان کو ماننا ضروری ہے۔

اور اگر کبھی تعجب کو دور کرنے کے لئے محض نقل شدہ چیزوں کی کوئی عقلی وجہ بتادی جائے تو یہ احسان ہوگا، ذمہ داری نہیں۔

❀...❀...❀

اصول نمبر ۶

دلیل جسے آج کل ثبوت بھی کہتے ہیں اور نظیر ایک چیز نہیں، اور مدعی سے دلیل کا مطالبہ کرنا درست ہے، نظیر کا نہیں۔

تشریح

اس اصول کو ایک مثال کے ذریعے سمجھیے۔

مثال ۱

کوئی شخص کہے کہ ۲۰۲۱ء میں افغانستان کے مجاہدین نے جدید اسلحہ سے لیس پینتالیس ممالک کی فوج کو محض اللہ کی مدد سے تنِ تنہا شکست دی۔ اس پر کوئی شخص کہے کہ ہم تو تب مانیں گے جب اس کی کوئی نظیر بھی پیش کرو کہ اس سے پہلے بھی کسی ملک نے پینتالیس ممالک کی فوج کو اکیلے شکست دی ہو اور اگر نظیر پیش نہ کرسکو تو ہم اس واقعہ کو غلط سمجھیں گے۔ تو کیا اس شخص کے ذمہ کسی نظیر کا پیش کرنا ضروری ہوگا یا یہ کہنا کافی ہوگا کہ اگرچہ اس کی نظیر ہمیں معلوم نہیں لیکن ہمارے پاس اس واقعے کی صحیح دلیل موجود ہے وہ یہ کہ اس واقعے کو دیکھنے والے موجود ہیں یا اگر موقع پر کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو یہ کہنا کافی ہوگا کہ اخباروں میں چھپا ہے۔ کیا اس دلیل کے بعد اس واقعہ کو ماننے کے لئے نظیر کا بھی انتظار ہوگا؟

مثال ۲

اسی طرح اگر کوئی شخص کہے کہ قیامت کے دن ہاتھ پاؤں بولیں گے تو کسی کو اس سے نظیر مانگنے کا حق نہیں اور نہ نظیر پیش نہ کرنے پر کسی کو اسے جھٹلانے کا حق ہے البتہ دلیل قائم کرنا اس کے ذمے ضروری ہے۔ اور چونکہ یہ نقل شدہ بات ہے اس لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس کا محال ہونا ثابت نہیں اور سچے شخص نے اس کے ہونے کی خبر دی ہے لہٰذا اس کو ماننا ضروری ہے۔ البتہ اگر مدعی کوئی نظیر بھی پیش کر

دے تو یہ اس کا احسان ہے۔ مثلاً کمپیوٹر کو اس کی نظیر میں پیش کردے کہ بے جان ہونے کے باوجود کس طرح بولتا ہے اسی طرح قیامت والے دن ہاتھ پاؤں بھی بولیں گے۔

آج کل یہ ظلم عام ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات محض نقل شدہ چیزوں کی نظیر مانگتے ہیں، جو کہ غلط ہے۔

❀...❀...❀

اصول نمبر ⑦

دلیل عقلی اور نقلی میں اختلاف کی صورتیں

دلیلِ عقلی اور نقلی میں اختلاف کی عقلاً چار صورتیں بنتی ہیں:

۱۔ دونوں دلیلیں قطعی ہوں۔ اس کا کہیں وجود نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے اس لئے کہ دو سچی دلیلوں میں اختلاف ہونا محال ہے۔

۲۔ دونوں دلیلیں ظنی ہوں۔ اس صورت میں دونوں دلیلوں کو جمع کرنے کے لئے اگرچہ دونوں کو ظاہری معنیٰ سے ہٹانے کی گنجائش ہے۔ مگر چونکہ لغت کا قانون ہے کہ الفاظ میں اصل ظاہری معنیٰ ہوتا ہے۔ اس لئے دلیلِ نقلی کو اس کے ظاہری معنیٰ پر رکھا جائے گا اور دلیلِ عقلی کو حجت نہیں سمجھا جائے گا۔

۳۔ دلیلِ نقلی قطعی ہو اور عقلی ظنی ہو۔ اس صورت میں لامحالہ دلیلِ نقلی کو ترجیح دی جائے گی۔

۴۔ دلیلِ عقلی قطعی ہو اور نقلی ظنی ہو خواہ ثبوت کے لحاظ سے یا دلالت کے لحاظ سے۔ اس صورت میں دلیلِ عقلی کو ترجیح دی جائے گی اور نقلی میں تاویل کی جائے گی۔ صرف یہ ایک جگہ ہے جہاں دلیلِ عقلی کو نقلی پر ترجیح دی جائے گی نہ کہ ہر جگہ پر۔

تشریح

پہلے چند اصطلاحات کا مطلب سمجھ لینا چاہئے۔

دلیلِ عقلی: دلیلِ عقلی کا مطلب ہے عقل کا کسی چیز کے موجود ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگانا۔ جیسے دھوپ دیکھ کر عقل کا سورج کے موجود ہونے کا حکم لگانا۔

دلیلِ نقلی: دلیلِ نقلی سچے شخص کی خبر کو کہتے ہیں۔ جیسے قرآن وحدیث وغیرہ

اختلاف: اختلاف کا مطلب ہے دو باتوں کا ایک دوسرے کے اس طرح مخالف ہونا کہ ایک کو صحیح ماننے سے دوسرے کو غلط ماننا لازم آئے، جیسے ایک شخص نے کہا آج دس بجے زاہد ریل گاڑی پر لاہور چلا گیا۔ دوسرے شخص نے کہا آج گیارہ بجے زاہد میرے ساتھ میرے گھر پر تھا۔ اسے اختلاف کہتے ہیں۔

چونکہ اختلاف کی صورت میں ایک کے صحیح ہونے سے دوسرے کا غلط ہونا لازم آتا ہے۔ اس لئے دو صحیح دلیلوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوگا۔ اور جب دو دلیلوں میں اختلاف ہوگا تو اگر وہ دونوں قابلِ تسلیم ہوں تو ایک میں تاویل کریں گے یعنی اس کو ظاہری معنیٰ سے ہٹا دیں گے اس طرح اسے بھی مان لیں گے اور دوسری دلیل کو اس کے ظاہر معنیٰ پر رکھ کر مان لیں گے۔ اور اگر ایک قابلِ تسلیم اور دوسری نا قابلِ تسلیم ہو تو ایک کو مان لیں گے اور دوسری کو رد کر دیں گے۔ مثلاً اسی مثال میں اگر ایک شخص معتبر ہو اور دوسرا غیر معتبر، تو معتبر کی بات مان لیں گے اور غیر معتبر کی بات رد کر دیں گے اور اگر دونوں معتبر ہوں تو دوسرے شواہد کے ذریعے جانچ پڑتال کر کے ایک کی بات مان لیں گے اور دوسرے کی بات میں تاویل کر لیں گے۔ مثلاً اور لوگوں کی گواہیوں سے بھی ثابت ہوا کہ زاہد لاہور نہیں گیا تو یوں کہیں گے کہ اس کو شبہ ہوا ہوگا یعنی وہ زاہد کے ہمشکل کوئی اور آدمی ہوگا یا ریل میں سوار ہو کر پھر واپس آ گیا ہوگا اور اس شخص کو واپسی کی اطلاع نہیں ہوئی ہوگی۔

جب یہ اصول معلوم ہو گیا تو اب سمجھنا چاہئے کہ جب کبھی دلیلِ نقلی اور عقلی میں ظاہراً اختلاف ہوگا تو اس وقت اس اصول کے مطابق دیکھیں گے کہ:

(۱) دونوں دلیلیں قطعی ہیں (۲) یا دونوں ظنی ہیں (۳) یا دلیلِ نقلی قطعی ہے اور عقلی ظنی (۴) یا دلیلِ عقلی قطعی ہے اور نقلی ظنی خواہ ثبوت کے لحاظ سے ظنی ہو یا دلالت کے لحاظ سے۔ یعنی دلیلِ نقلی کے ظنی ہونے کی دو صورتیں ہیں: (۱) ثبوتاً ظنی ہو۔ مثلاً کوئی حدیث جو ثبوت کے لحاظ سے متواتر یا مشہور نہ ہو بلکہ غریب ہو (۲) دلالۃً ظنی ہو اگرچہ ثبوتاً قطعی ہو۔ مثلاً قرآن کی کوئی آیت جس میں دو معنوں کا احتمال ہو، اس صورت میں آیت کا ثبوت تو بلا شبہ قطعی ہوگا قرآن کی آیت ہونے کی وجہ سے مگر دو معنوں میں سے ہر معنیٰ پر آیت کی دلالت ظنی ہوگی کیونکہ کوئی ایک معنیٰ متعین نہیں ہے۔ الغرض دلیلِ عقلی اور نقلی میں اختلاف کی یہ چار صورتیں ہیں۔ ان چاروں کا حکم مختلف ہے۔

پہلی صورت کا حکم

پہلی صورت یعنی دلیلِ عقلی اور نقلی دونوں ثبوتاً اور دلالۃً قطعی ہوں، یہ محال ہے، کیونکہ دو سچی دلیلوں میں اختلاف نہیں ہوسکتا ورنہ دونوں کا سچا ہونا ناممکن ہے۔

مثال

کوئی شخص قیامت تک اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کرسکتا کیونکہ یہ محال ہے۔

دوسری صورت کا حکم

دوسری صورت یعنی دلیلِ عقلی اور نقلی دونوں ظنی ہوں۔اس صورت میں چونکہ دلیل نقلی ظنی کو لازمی ماننے پر صحیح دلائل موجود ہیں اور دلیلِ عقلی ظنی کو لازمی ماننے پر کوئی صحیح دلیل موجود نہیں ہے اس لئے اس وقت دلیلِ نقلی کو ترجیح دیں گے اور دلیلِ عقلی کو غلط سمجھیں گے۔اور اس کے ظنی ہونے کا یہی مطلب ہے کہ ممکن ہے کہ غلط ہو۔لہٰذا اس کو غلط ماننے میں بھی کسی عقلی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی گئی۔اگرچہ اس صورت میں دلیلِ نقلی کو ماننے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ اسے ظاہری معنیٰ سے پھیر لیتے لیکن چونکہ بغیر ضرورت کے دلیلِ نقلی میں تاویل کرنا منع ہے اور یہاں کوئی ضرورت تھی نہیں اس لئے اس صورت کا اختیار کرنا شرعاً ناجائز و بدعت اور عقلاً ناپسندیدہ ہے۔

مثال

آیتِ مبارکہ ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ [الانبیاء، آیت: ۳۳] ترجمہ: ”اور وہی (اللہ) ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند پیدا کیے سب کسی نہ کسی مدار میں تیر رہے ہیں۔“ اس آیت کے ظاہری الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج اپنے مدار میں چکر لگا رہا ہے۔یہ آیت تو قطعی ہے لیکن اس آیت میں ”تیرنے“ کا لفظ آیا ہے اس سے ”چکر لگانا“ مراد ہونا ظنی ہے۔جبکہ بعض فلسفی مثلاً فیثاغورث اور کوپرنیکس وغیرہ سورج کو ساکن قرار دیتے ہیں مگر ان کے پاس اس کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے، بلکہ ظنی ہے۔اب یہاں پر دلیلِ نقلی ظنی اور عقلی ظنی میں اختلاف ہوگیا۔اور ان دونوں میں اختلاف کی صورت میں دلیلِ نقلی کو ترجیح دی جاتی ہے اور دلیلِ عقلی کو غلط سمجھا جاتا ہے۔اس لئے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ سورج اپنے مدار میں چکر لگا رہا ہے، ساکن نہیں ہے۔

تیسری صورت کا حکم

تیسری صورت یعنی دلیلِ نقلی قطعی ہو اور عقلی ظنی ہو۔اس صورت کا حکم بھی وہی ہے جو دوسری صورت کا ہے یعنی دلیلِ نقلی کو ترجیح دیں گے اور دلیلِ عقلی کو غلط سمجھیں گے، کیونکہ جب دلیلِ نقلی ظنی کو عقلی ظنی پر ترجیح حاصل ہے تو نقلی قطعی کو تو لامحالہ ہو گی۔

مثال

چونکہ تیسری صورت کا حکم بھی وہی ہے جو دوسری صورت کا ہے اس لئے تیسری صورت کی الگ سے مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چوتھی صورت کا حکم

چوتھی صورت یعنی دلیلِ عقلی قطعی ہو اور نقلی ظنی ہو۔اس صورت میں دلیلِ عقلی کو اس لئے نہیں چھوڑ سکتے کہ وہ قطعی ہے۔اور دلیلِ نقلی اگر چہ ظنی ہے لیکن چونکہ نقلی ظنی کو ماننا بھی ضروری ہے اس لئے اسے بھی نہیں چھوڑ سکتے۔لہٰذا اس صورت میں دلیلِ عقلی قطعی کو اس کے ظاہری معنیٰ کے ساتھ اور دلیلِ نقلی ظنی کو تاویل کر کے اور اسے دلیلِ عقلی کے مطابق کر کے قبول کریں گے۔یہی ایک صورت ہے جہاں دلیلِ عقلی کو نقلی پر ترجیح دیں گے۔دوسری اور تیسری صورت میں دلیلِ عقلی کو ترجیح دینا درست نہیں ہے۔

مثال

آیتِ مبارکہ ہے:﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ﴾ [الکھف، آیت:۸۶] ترجمہ:''یہاں تک کہ جب وہ (ذوالقرنین) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچے تو انہیں دکھائی دیا کہ وہ ایک دلدل جیسے (سیاہ) چشمے میں ڈوب رہا ہے۔''اس آیت کے ظاہری الفاظ سے غور کرنے سے پہلے یہ وہم ہوسکتا ہے کہ سورج زمین میں دلدل نما ایک کالے چشمے میں غروب ہوتا ہے۔حالانکہ قطعی عقلی دلائل سے ثابت ہے کہ سورج اپنی حرکت کے دوران کسی بھی وقت زمین سے نہیں لگتا، ہمیشہ جدا رہتا ہے۔اب یہاں پر دلیلِ عقلی قطعی اور نقلی ظنی میں اختلاف ہوگیا۔اس صورت میں چونکہ دلیلِ عقلی کو ترجیح دی جاتی ہے اور نقلی میں تاویل کی جاتی ہے، اس لئے یہ کہا جائے گا کہ سورج زمین کے کسی دلدل نما کالے چشمے میں غروب نہیں ہوتا، اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین مغرب میں اس وقت کی دنیا کی آخری آبادی پر پہنچے جس سے آگے کوئی آبادی نہیں تھی۔وہاں تاحدِ نگاہ سمندر پھیلا ہوا تھا اور وہ ایسے لگتا تھا جیسے دلدل کا کالا چشمہ ہو۔اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا اور ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے

سورج اس دلدل نما کالے چشمے میں ڈوب رہا ہے۔ جس طرح سمندر میں سفر کرنے والوں کو ایسے لگتا ہے جیسے سورج سمندر میں ڈوب رہا ہے۔

پانچویں اور چھٹی صورت

پانچویں اور چھٹی صورت بھی نکل سکتی ہے کہ دلیلِ نقلی قطعی اور عقلی وہمی وخیالی ہو یا دلیلِ نقلی ظنی اور عقلی وہمی وخیالی ہو۔

دونوں کا حکم

ان دونوں صورتوں کا حکم تو بالکل ظاہر ہے کہ دلیل نقلی کو قبول کیا جائے گا اور عقلی کو چھوڑ دیا جائے گا۔ کیونکہ عقلی کو جب ظنی ہونے کے باوجود چھوڑ دیا گیا ہے تو وہمی وخیالی ہونے کی صورت میں تو لامحالہ چھوڑ دیا جائے گا۔

یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو ہر حال میں دلیلِ عقلی کو دلیلِ نقلی پر ترجیح دیتے ہیں چاہے دلیلِ عقلی ظنی بھی نہ ہو صرف وہمی وخیالی ہو اور چاہے دلیلِ نقلی قطعی ہی کیوں نہ ہو۔

❀...❀...❀

تنبیہ (۱)

مادہ حادث ہے

پہلے چند اصطلاحات کو جان لینا چاہیے:

مادہ: وہ عنصر جس سے تمام مادی چیزیں بنی ہوئی ہیں۔

حادث: وہ چیز جو پہلے موجود نہ ہو بعد میں وجود میں آئے۔

قدیم: وہ چیز جو ہمیشہ سے موجود ہو۔

صورتِ جسمیہ: کسی چیز کی جسمانی شکل وہیئت۔

صورتِ نوعیہ: کسی چیز کی وہ صورت جس کی وجہ سے وہ چیز دوسری انواع سے الگ ہوجاتی ہے۔

صورتِ شخصیہ: کسی چیز کی مخصوص شکل وصورت جس کی وجہ سے وہ چیز اسی نوع کی دوسری چیزوں سے ممتاز ہوجاتی ہے۔

مثال

جیسے حامد ایک شخص ہے۔ جس چیز سے یہ بنا ہے اسے "مادہ" کہتے ہیں۔ اس کا ایک جسم ہے اسے

''صورتِ جسمیہ'' کہتے ہیں۔اس کی ایک نوع ہے یعنی انسان اسے ''صورتِ نوعیہ'' کہتے ہیں۔اس کی ایک مخصوص شکل وصورت ہے اسے ''صورتِ شخصیہ'' کہتے ہیں۔ یہ پہلے نہیں تھا بعد میں وجود میں آیا اسے ''حادث'' کہتے ہیں۔

سائنس کو اپنا راہنما بنانے اور اس کی پیروی کرنے سے مسلمانوں کو عقیدہ توحید میں جو کہ اسلام کی بنیاد ہے دو سنگین غلطیاں پیش آئیں۔اور ان غلطیوں کی وجہ سے یہ لوگ نہ سائنس کے مکمل پیروکار رہے نہ اسلام کے جیسے کہ آگے معلوم ہوگا۔

غلطی

ایک غلطی تو یہ کی کہ اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ''قدیم'' میں ایک دوسری چیز کو بھی شریک کرلیا یعنی مادہ کو بھی قدیم مانا۔سائنس والوں کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔دوسرے دعووں کی طرح اس میں بھی اندازے سے کام لیا یعنی یہ خیال کیا یہ سب موجودات اگر پہلے معدوم تھے تو ان کا عدم سے وجود میں آنا سمجھ میں نہیں آتا۔

جواب

کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔اور پھر سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ ایک ایسا موجود یعنی مادہ جس کی تمام اقسام پہلے معدوم تھیں وہ خود پہلے معدوم نہ ہو۔لہٰذا سمجھ میں نہ آنا تو مادہ کو چاہے قدیم مانا جائے یا حادث، دونوں میں مشترک ہے۔

البتہ قدیم ماننے میں اصل خرابی یہ ہے کہ اس کے باطل ہونے پر مستقل دلیل بھی موجود ہے۔وہ یہ ہے کہ موجودہ سائنس میں مادہ کو ایک مدت تک صورتِ جسمیہ سے خالی مانا گیا ہے، جبکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مادہ کا صورتِ جسمیہ سے خالی ہونا محال ہے۔کیونکہ مادہ کا مطلب ہے: ''کسی چیز کا موجود ہونے کی طاقت رکھنا۔'' جبکہ حقیقت میں کسی چیز کا وجود صورت کے ساتھ ہی ہوتا ہے، چنانچہ مادہ کو بغیر صورت کے موجود کہنا درحقیقت دو متضاد چیزوں کے جمع ہونے کا قائل ہونا ہے، یعنی ایک طرف آپ کہہ رہے ہیں کہ مادہ موجود تھا اور دوسری طرف کہہ رہے ہیں کہ بغیر صورت کے تھا جو کہ ناممکن ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مادہ خود موجود ہی نہ ہو۔قدیم ہونا تو دور کی بات ہے۔

اور اگر قدیم فلسفہ کے مطابق مادہ میں کوئی صورت مانی جائے تو یہ ظاہر ہے کہ کوئی صورتِ جسمیہ صورتِ نوعیہ کے بغیر اور کوئی صورتِ نوعیہ صورتِ شخصیہ کے بغیر نہیں ہوسکتی۔لہٰذا جب کوئی صورت مادہ میں مانی جائے گی تو لازماً وہاں صورتِ شخصیہ بھی ہوگی اور صورتِ شخصیہ بدلتی رہتی ہے۔تو جب بعد والی

صورتِ شخصیہ آئی تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو پہلی والی صورتِ شخصیہ بھی باقی رہے گی یا ختم ہو جائے گی۔ اگر باقی رہے گی تو چونکہ شخص ہونا صورتِ شخصیہ سے ہوتا ہے۔ جب دو صورتِ شخصیہ ہو گئیں تو وہ دو شخص ہو گئے یعنی لازم آیا کہ ایک شخص دو شخص ہو جائے اور یہ محال ہے۔

اگر پہلی صورت ختم ہو گئی تو وہ قدیم نہیں تھی اس لئے کہ قدیم کا ختم ہونا محال ہے۔ لہٰذا وہ حادث ہوئی اور اس سے پہلے جو صورتِ شخصیہ تھی اسی دلیل سے وہ بھی حادث ہو گئی۔ جب صورتِ شخصیہ کے تمام افراد حادث ہوئے تو خود صورتِ شخصیہ بھی حادث ہوئی۔ یعنی پہلے معدوم تھی بعد میں وجود میں آئی۔ جب وہ معدوم ہو گی تو اس وقت صورتِ نوعیہ بھی معدوم ہو گی اور اس کے معدوم ہونے سے صورتِ جسمیہ بھی معدوم ہو گی اور اس کے معدوم ہونے سے مادہ بھی معدوم ہو گا۔ لہٰذا مادہ کا قدیم ہونا باطل ثابت ہوا۔

نیز عدم سے وجود میں آنا جو سمجھ میں نہیں آتا اس کا نام ''عجیب'' ہے ''محال'' نہیں۔ اور عجیب چیزوں کا واقع ہونا ناممکن نہیں ہے۔ ان دونوں کو خلط ملط کرنا بہت سی غلطیوں کا سبب بنتا ہے۔

اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ مادہ کو قدیم ماننے والے یہ حضرات اسلام کے مخالف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ موجودہ سائنس کے بھی مخالف ہیں اس لئے کہ اہلِ سائنس مادہ کو قدیم ماننے کے ساتھ ساتھ خدا کے بھی قائل نہیں۔ اور یہ لوگ خدا کو مانتے ہیں۔ اس لئے شروع میں کہا تھا کہ یہ لوگ دونوں کے مخالف ہیں۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو مادہ کو قدیم ماننے کے بعد خدا کی ضرورت ہی نہیں رہتی، کیونکہ جب مادہ کی ذات ہی اس کے وجود کا باعث ہے تو وہ واجب الوجود ہو گیا۔ اور واجب الوجود کا کسی دوسرے کا محتاج ہونا خلافِ عقل ہے، لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ مادہ کسی کا محتاج نہ ہو، خدا کا بھی نہیں، اور جب خدا کا محتاج نہیں تو خدا کی ضرورت بھی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کا قائل ہونا خود مادہ کے حادث ہونے پر موقوف ہے۔ اس لئے کہ جو تعلق اللہ تعالیٰ کا اپنی باقی صفات اور افعال کے ساتھ ہے وہی تعلق اس کا اپنی صفات ''حرکت وحرارت'' اور اپنے افعال ''تنوعات'' وغیرہ سے ہے، یعنی جس طرح باقی صفات اور افعال قدیم ہیں اسی طرح یہ بھی قدیم ہیں، اور ان صفات وافعال کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز حادث ہو، لہٰذا خدا کا قائل ہونا خود مادہ کے حادث ہونے پر موقوف ہے۔

اور اگر کوئی شخص مادہ کے اجزاء کو صورت کے ساتھ قدیم مانے اور اس صورت کو آخری صورت کے ساتھ جمع مانے اس طرح سے کہ وہ چھوٹے چھوٹے ذروں کی شکل میں تھا جن میں عقلی اور وہمی تقسیم ممکن ہے مگر حقیقت میں تقسیم ممکن نہیں جیسا کہ دی مقراطس بھی ایسے اجزاء کا قائل تھا، یا مادہ کو صورت کے ساتھ متصل مان کر اس میں قابلِ تحلیل اجزاء کا قائل ہو۔ تو ہم پوچھتے ہیں کہ یہ ذرات یا اجزاء متحرک تھے یا

ساکن؟ اگر متحرک تھے تو ان کی حرکت قدیم تھی اور اگر ساکن تھے تو ان کا سکون قدیم تھا، جبکہ اس وقت ہم بعض اجسام کو متحرک دیکھتے ہیں، ان کی حرکت کی وجہ سے وہ اجزاء بھی متحرک ہیں، جس سے سکون ختم ہوگیا۔ اور بعض اجسام کو ہم ساکن دیکھتے ہیں، ان کے سکون کی وجہ سے وہ اجزاء بھی ساکن ہیں، جس سے حرکت ختم ہوگئی۔ الغرض حرکت وسکون دونوں کو ختم ہوتا دیکھ رہے ہیں جبکہ قدیم کا ختم ہونا محال ہے لہٰذا ان اجزاء کی حرکت یا سکون کا قدیم ہونا محال ہے، اور اجزاء ان دو حال سے خالی نہیں لہٰذا ثابت ہوگیا کہ خود یہ اجزاء بھی قدیم نہیں۔

اور اگر مادہ کے حادث ہونے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا اسے عدم سے وجود میں لانا سمجھ میں نہیں آتا تو یہ محض عجیب ہے، محال نہیں۔ اور پھر یہ کب سمجھ میں آتا ہے کہ ایک بدلتے رہنے والی چیز قدیم ہو سمجھ میں نہ آنا تو دونوں میں مشترک ہے، اس لئے یہ بات دلیل نہیں بن سکتی، لہٰذ ثابت ہوا کہ مادہ کا قدیم ہونا بلاشبہ باطل اور محال ہے۔

اور اگر ہم ان سب دلائل کو ایک طرف رکھ کر مادہ کے قدیم ہونے کو محال نہ بھی کہیں تو بھی مادہ کے قدیم ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے، لہٰذا قدیم ہونے اور نہ ہونے دونوں کا برابر امکان ہوگا۔ اس صورت میں عقلاً دونوں کا قائل ہونا ممکن ہوگا، لیکن ایسی صورت میں اگر سچا خبر دینے والا کسی ایک جانب کو متعین کردے تو اس کو ماننا ضروری ہوتا ہے، یہاں پر حادث ہونے کی جانب کو متعین فرمادیا گیا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ [البقرہ، آیت: ۱۱۷] ترجمہ: ”(وہ اللہ) آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔“ اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”كَانَ اللهُ وَ لَمۡ يَكُنۡ شَيۡءٌ غَيۡرَهٗ“ [صحیح بخاری، حدیث: ۳۱۹۱] ترجمہ: ”اللہ تھا اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔“ اس آیتِ مبارکہ اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ پہلے صرف اللہ تھا، اور کچھ نہیں تھا۔ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے بعد میں پیدا کی ہیں۔ لہٰذا نقلی طور پر بھی مادہ کو حادث ماننا ضروری ہے۔

❀...❀...❀

تنبیہ ۲

اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے

پہلی غلطی کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ”قدیم“ کو غیر اللہ کے لئے ثابت کرنا تھا۔ جبکہ دوسری غلطی کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کو اللہ تعالیٰ سے نفی کرنا ہے، اور وہ مخصوص صفت ”ہر چیز پر قدرت“ ہے۔

غلطی

اس زمانے میں بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات کی زبان اور قلم پر یہ جملہ عام ہو چکا ہے کہ خلافِ فطرت کوئی چیز واقع نہیں ہوسکتی۔اس کی دو دلیلیں دی جاتی ہیں: عقلی اور نقلی۔

عقلی دلیل

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ آگ ہمیشہ جلاتی ہے،کبھی اس کے خلاف نہیں دیکھا۔اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ماں باپ کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے،کبھی اس کے خلاف نہیں دیکھا۔اس سے معلوم ہوا کہ فطرت کے خلاف ہونا محال ہے۔

اسی بناء پر معجزات کا انکار کر دیا۔بعض کا صراحتاً انکار کر دیا کہ اس واقعے کو ہی جھٹلا دیا،اور جہاں واضح قرآنی آیات یا احادیث موجود ہونے کی وجہ سے واقعہ کو جھٹلا ناممکن نہیں تھا وہاں در پردہ انکار کیا کہ اس کی تاویل نکال لی،اور جب معجزات کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو اولیاء کی کرامات کا تو پوچھنا ہی کیا، اور اس سب کی بنیاد خلافِ فطرت کے محال ہونے کا عقیدہ رکھنا ہے۔

جواب

ظاہر ہے یہ ایک دعویٰ ہے اور دعوے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔صرف یہ کہنا دلیل نہیں بن سکتا کہ ہم نے کبھی ایسا دیکھا نہیں ہے۔اس لئے کہ اس کا مطلب ''استقراءِ ناقص'' ہے یعنی چند جزئیات کا مشاہدہ کرنا۔اس سے دوسری جزئیات جن کا مشاہدہ نہیں کیا پر قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا، البتہ ظن کے درجے میں دوسری جزئیات کے لئے بھی اس حکم کو ثابت کیا جاسکتا ہے،لیکن یہ ظن وہاں حجت ہوگا جہاں زیادہ قوی دلیل اس کے خلاف نہ ہو اور وہاں بھی ہیشگی کا حکم محض ظن کے درجے میں ہوگا۔اور ہیشگی سے ضروری ہونا ثابت نہیں ہوتا یعنی مخالف جانب کا ناممکن ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ مخالف جانب کی نفی کے لئے مستقل دلیل درکار ہوتی ہے۔اور جہاں زیادہ قوی دلیل اس کے خلاف ہو وہاں اس ظن کا کوئی اثر نہیں رہے گا بلکہ زیادہ قوی دلیل پر عمل کیا جائے گا۔

الغرض استقراءِ ناقص سے دوسری جزئیات میں جن کا مشاہدہ نہیں کیا جانبِ مخالف کی نفی نہیں ہوتی اور معجزات وغیرہ میں زیادہ قوی دلیل یعنی آیت یا حدیث استقراءِ ناقص کے خلاف موجود ہے،تو پھر کیوں اس زیادہ قوی دلیل کو حجت نہ سمجھا جائے؟ یا اس میں دور دراز کی تاویل کی جائے؟ جبکہ تاویل میں ظاہر سے انحراف ہوتا ہے،اس لئے بلا ضرورت اس کا استعمال نہیں کیا جاتا،اور یہاں ضرورت ہے

نہیں پھر تاویل کیوں کی جائے؟ ورنہ یوں تو ہر چیز میں ایسے احتمالات پیدا کر کے کسی بھی ثبوت اور کسی بھی گواہی کو حجت نہیں کہا جا سکتا۔

نقلی دلیل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا﴾ [الاحزاب، آیت: ۶۲] ترجمہ: ''اور تم اللہ کے معمول میں کوئی تبدیلی ہرگز نہیں پاؤ گے۔'' اس آیت سے معلوم ہوا کہ فطرت کے خلاف کوئی چیز واقع نہیں ہو سکتی کیونکہ فطرت معمول ہی ہے۔

جواب

اس آیت سے دلیل پکڑنا تب درست ہو گا جب اس آیت میں معمول سے تمام معمولات مراد ہوں اور تبدیل کرنے والا عام ہو چاہے اللہ ہو یا غیر اللہ ہو۔ یعنی آیت کا مطلب یہ ہو کہ اللہ کے کسی معمول کو کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا نہ اللہ نہ غیر اللہ۔ جبکہ ایسا نہیں ہے، سیاق وسباق کی روشنی میں یہاں معمول سے خاص معمول مراد ہے، اور وہ ہے: ''باطل پر حق کا غلبہ ہے چاہے دلیل کے ذریعے ہو یا طاقت کے ذریعے۔'' یعنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق باطل پر غالب رہے گا اللہ کے اس معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

اور اگر معمول کو عام مانا جائے تو پھر تبدیل کرنے والا خاص ہو گا یعنی غیر اللہ۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے کسی معمول کو کوئی غیر اللہ نہیں بدل سکتا۔ اللہ کے معمول اور فیصلے دنیاوی حکمرانوں کے فیصلوں کی طرح نہیں ہوتے جنہیں سیاسی مخالفین دباؤ ڈال کر تبدیل کروا لیتے ہیں اس آیت کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ کا وعدہ اور وعید پکے ہوتے ہیں کوئی غیر اللہ انہیں تبدیل نہیں کر سکتا۔

اس آیت میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے معمول کو بدل سکتا ہے یا نہیں۔ اس لئے آپ اس آیت سے دلیل نہیں پکڑ سکتے۔ جبکہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے معمول کو تبدیل کرنے سمیت ہر چیز پر قادر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ﴾ [البقرہ، آیت: ۲۰] ترجمہ: ''بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

عقلی اور نقلی دلیل

اس دعوے کی ایک تیسری دلیل بھی پیش کی جاتی ہے جو عقلی اور نقلی دونوں دلیلوں سے مرکب ہے۔ وہ یہ ہے کہ ''اللہ کا معمول'' ایک عملی وعدہ ہے اور اللہ کا وعدے کی خلاف ورزی کرنا قرآن کے مطابق

محال ہے۔ جیسے کہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ [ال عمران، آیت: ۹] ترجمہ: ''بے شک اللہ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ معمول کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

جواب

پہلا جملہ ''اللہ کا معمول ایک عملی وعدہ ہے'' عقلی ہے۔ اور دوسرا جملہ ''اللہ کا وعدے کی خلاف ورزی کرنا محال ہے'' نقلی ہے۔ دوسرا جملہ تو بالکل صحیح ہے لیکن پہلا جملہ تسلیم نہیں، اس لئے کہ موسمِ برسات میں بارش ہوتے ہوتے جب پہلی بار کسی سال بارش نہیں ہوئی ہوگی تو اگر یہ معمول یعنی موسمِ برسات میں بارش کا ہونا وعدہ تھا تو اس وعدے کی خلاف ورزی کیسے ہوگئی؟ اس سے معلوم ہوا کہ معمول عملی وعدہ نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے خلاف ہونا محال نہیں ہے۔

اعتراض

موسمِ برسات میں ہر سال بارش ہونا اور پہلی دفعہ کسی سال نہ ہونا معمول کے خلاف نہیں ہے اس لئے کہ اصل معمول طبعی اسباب پر اثرات کو مرتب کرنا ہے، اور یہ بارش ہونا اور نہ ہونا اس کے تحت داخل ہے، یعنی جب بارش کے اسباب بادل وغیرہ ہوں گے تو بارش ہوگی اور جب بادل وغیرہ نہیں ہوں گے تو بارش بھی نہیں ہوگی۔

جواب

چونکہ طبعی اسباب اللہ کی قدرت اور ارادے کے محتاج ہیں، اس لئے بنیادی معمول اللہ تعالیٰ کا اپنی قدرت اور ارادے سے کرنا ہے۔ اس اعتبار سے خلافِ معمول بھی معمول کے مطابق ہوگیا، یعنی جو کام بظاہر خلافِ معمول لگتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور ارادے سے کرتا ہے لہٰذا وہ بھی معمول کے مطابق ہوگیا تو پھر واقعات کا انکار کرنے یا ان میں تحریف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

❀...❀...❀

تنبیہ ③

نبوت

نبوت کے متعلق چند غلطیاں کی جارہی ہیں۔

غلطی ①

پہلی غلطی وحی کی تعریف میں کی جارہی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اجتہاد کے بعض دعویدار یہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں میں فطرتاً اپنی قوم کی ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے، اس لئے ان پر اس قسم کے خیالات

غالب رہتے ہیں۔جس کی وجہ سے بعض باتیں ان کے ذہن میں پیدا ہوجاتی ہیں،بعض اوقات کوئی آواز بھی سنائی دیتی ہے،بعض اوقات کوئی شکل بھی نظر آتی ہے اور وہ شکل باتیں کرتی ہوئی بھی معلوم ہوتی ہے،جبکہ حقیقت میں اس آواز یا شکل یا کلام کا کوئی وجود نہیں ہوتا سب خیالی چیزیں ہوتی ہیں۔

جواب

وحی کی یہ تعریف قرآن وحدیث کے سراسر خلاف ہے۔قرآن وحدیث میں صراحتاً بتایا گیا ہے کہ وحی ایک غیبی فیض ہے جو فرشتے کے ذریعے سے ہوتا ہے۔وہ فرشتہ کبھی دل میں وحی ڈال دیتا ہے جسے حدیث میں ’’نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ‘‘ فرمایا گیا ہے۔کبھی اس کی آواز سنائی دیتی ہے جسے حدیث میں ’’یَأْتِیْنِیْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ‘‘فرمایا گیا ہے،کبھی وہ سامنے آکر بات کرتا ہے جسے’’یَأْتِیْنِی الْمَلَکُ اَحْیَانًا فَیَتَمَثَّلُ لِیْ‘‘فرمایا گیا ہے۔[صحیح الجامع،حدیث:۲۰۸۵،صحیح بخاری،حدیث:۲]

غلطی ۲

دوسری غلطی معجزات کے متعلق ہے۔معجزات ایسے کاموں کو کہتے ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھوں بغیر طبعی اسباب کے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔جدید سائنس میں بغیر دلیل کے ان کا بھی انکار کیا گیا ہے۔اسی وجہ سے جو معجزات قرآن وحدیث میں آئے ہیں ان میں دور دراز کی تاویل بلکہ تحریف کر کے ان کو معمول کے مطابق بنادیا جاتا ہے۔اکثر کو بالکل غیر عجیب بنا دیتے ہیں جیسے:﴿فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾[البقرہ،آیت:۶۰] میں کیا۔اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو،پتھر پر لاٹھی ماری تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے،یہاں پر جدید سائنس سے مرعوب حضرات نے یہ تاویل نکالی کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی لاٹھی کے ذریعے پتھر پر چڑھو،جب پتھر پر چڑھے تو دیکھا اوپر بارہ چشمے بہہ رہے ہیں۔اور جہاں غیر عجیب نہ بن سکے وہاں مسمریزم (وہ علم جس کے ذریعے دوسروں کے خیالات کو کنٹرول کیا جاتا ہے) کے تحت داخل کر دیا جاتا ہے،جیسے موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے اژدہا بن جانے کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

جواب

اللہ تعالیٰ نے جس طرح طبعی اسباب کو بغیر طبعی اسباب کے پیدا کیا ہے ورنہ تسلسل لازم آئے گا جو کہ محال ہے،اسی طرح ان اسباب کے ذریعے ہونے والے کاموں کو ان اسباب کے بغیر بھی پیدا کر سکتا ہے،زیادہ سے زیادہ اس کو عجیب کہیں گے،مگر عجیب ہونا اور محال ہونا ایک چیز نہیں ہے۔

غلطی ③

تیسری غلطی یہ ہے کہ معجزات کو نبوت کی دلیل نہیں مانا جاتا بلکہ صرف اعلیٰ تعلیم اور اچھے اخلاق کو دلیل مانا جاتا ہے، اور اس کی دلیل اس کے سوا کوئی بیان نہیں کی جاسکتی کہ اگر معجزات کو نبوت کی دلیل کہا جائے تو جادو اور مسمریزم بھی نبوت کی دلیل ہوں گے۔

جواب

یہ دلیل ناکارہ ہے، اس لئے کہ جادو اور مسمریزم حقیقت میں خلافِ عادت نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے خفیہ طبعی اسباب ہوتے ہیں۔ ماہرین ان اسباب کو جان کر مدعی کو جھٹلا سکتے ہیں اور اس سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جبکہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں منکرین میں سے کوئی شخص نہ طبعی سبب نکال سکا اور نہ مقابلہ کر سکا، جس سے واضح ہوگیا کہ وہ حقیقت میں خلاف عادت ہیں، لہٰذا معجزات اور جادو دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہاں! اعلیٰ تعلیم اور اچھے اخلاق بھی نبوت کی دلیل ہیں، مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں دونوں طرح کے لوگ تھے۔ اعلیٰ فہم وفراست والے لوگ بھی جو کہ تعلیم اور اخلاق کے بلند ترین درجہ جو کہ عادت سے ماوراء ہے کا اندازہ کر سکتے تھے، اور معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ بھی جو تعلیم اور اخلاق کو نبوت کی دلیل سمجھنے میں اس وجہ سے غلطی کر سکتے تھے کہ وہ ان کے بلند ترین درجہ کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہر صاحبِ علم اور بااخلاق کو نبی سمجھ لیتے۔ اس لئے ایک دلیل ان کی استعداد کے مطابق بھی رکھی گئی جو ان کو دعویٰ نبوت کو صحیح ماننے پر مجبور کردے، اور دوسرے جادوگروں سے اس لئے شبہ نہیں ہوسکتا کہ یہ خود دیکھتے ہیں کہ ماہر جادوگر بھی مقابلے سے عاجز آگئے۔

غلطی ④

چوتھی غلطی یہ ہے کہ نبوت کے احکام کو صرف آخرت کے متعلق سمجھتے ہیں اور دنیاوی معاملات میں اپنے آپ کو آزاد قرار دیتے ہیں۔

جواب

قرآن وحدیث اس بات کی تردید کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ [الاحزاب، آیت:۳۶]

ترجمہ: ''اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ کردیں تو نہ کسی مومن مرد کے لئے یہ گنجائش ہے نہ کسی مومن عورت کے لئے کہ ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔'' یہ آیت مبارکہ ایک دنیاوی معاملے کے پس منظر میں ہی نازل ہوئی تھی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ

جب اللہ اوراس کا رسول کسی معاملے میں کوئی حکم فرمادیں تو کسی کو اس میں اختیار نہیں رہتا۔

حدیث تابیر اور ایک شبہ

حدیث میں آتا ہے: ''اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ سَمِعَ أَصْوَاتًا، فَقَالَ: مَا هٰذَا الصَّوْتُ؟ قَالُوْا: النَّخْلُ يُأَبِّرُوْنَهُ، فَقَالَ: لَوْ لَمْ يَفْعَلُوْا لَصَلُحَ ، فَلَمْ يُأَبِّرُوْا عَامَئِذٍ، فَصَارَ شِيْصًا، فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: اِنْ كَانَ شَيْئًا مِّنْ اَمْرِ دُنْيَاكُمْ، فَشَأْنُكُمْ بِهٖ، وَ اِنْ كَانَ شَيْئًا مِّنْ اَمْرِ دِيْنِكُمْ، فَإِلَيَّ'' [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۴۷۱] ترجمہ: نبی اکرم ﷺ نے کچھ آوازیں سنیں تو پوچھا: ''یہ کیسی آواز ہے؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: لوگ کھجور کی پیوندکاری کررہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر تھا۔'' چنانچہ اس سال لوگوں نے پیوندکاری نہیں کی، نتیجۃً کھجور خراب نکلی۔ لوگوں نے نبی ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تمہارا کوئی دنیاوی کام ہو تو وہ تم جانو، البتہ اگر تمہارا کوئی دینی کام ہو تو وہ مجھ سے معلوم کیا کرو۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ دینی کاموں میں ہمیں اختیار نہیں ہے لیکن دنیاوی معاملات میں ہمیں اختیار ہے۔

جواب

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جن دنیاوی معاملات میں شریعت نے صرف مشورہ دیا ہو یا خاموشی اختیار کی ہو ان میں اختیار ہے۔ البتہ جن دنیاوی معاملات میں شریعت نے باقاعدہ کوئی حکم دیا ہو ان میں کوئی اختیار نہیں ہے، اور یہ بالکل واضح بات ہے۔ آج کل کے عارضی حکمرانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ قوانین کے ذریعے ہمارے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں تو کیا حاکمِ حقیقی کو اس کا حق نہیں ہے؟

غلطی ﴿۵﴾

اس چوتھی غلطی سے ایک پانچویں غلطی نکلتی ہے کہ معاملات کے متعلق شرعی احکام کو ہر زمانے میں قابلِ ترمیم سمجھتے ہیں۔

جواب

اگر یہ احکام بذاتِ خود مقصود نہ ہوتے تو پھر یہ سمجھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن چونکہ یہ احکام خود مقصود ہیں، اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہے۔

عقلی شبہ

جب زمانے کے بدلنے سے مصلحتیں بدل جاتی ہیں اور اسی وجہ سے پہلی والی شریعتیں منسوخ ہوتی رہی ہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک کل چھ سو سال کا عرصہ ہے اس مدت میں تو مصلحتوں کے بدلنے سے احکام تبدیل ہو گئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اس وقت تک اس سے دگنی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت گزر گئی ہے مگر اب تک مصلحتیں نہیں بدلیں؟

جواب

جب قانون بنانے والا مکمل فہم وفراست کا مالک اور غیب کو جاننے والا ہو تو عین ممکن ہے کہ وہ جب چاہے ایسے قوانین بنادے جن میں قیامت تک کے زمانوں کی مصلحتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

اعتراض

اس وقت ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ شریعت پر عمل کرنے سے زندگی میں تنگی پیش آرہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام اس زمانے کے مناسب نہیں ہیں۔

جواب

یہ بات اس وقت صحیح ہوسکتی تھی جب سب اس پر عمل کر رہے ہوں اور پھر کام رکنے لگیں، اور یہ کوئی ثابت نہیں کرسکتا۔ اس وقت جو تنگی پیش آرہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عمل نہ کرنے والے زیادہ ہیں اور عمل کرنے والے کم۔ جب ان تھوڑوں کو زیادہ سے واسطہ پڑے گا تو ضرور معاملات میں تنگی پیش آئے گی، تو تنگی پیش آنے کی وجہ اکثریت کا شریعت پر عمل نہ کرنا ہے نہ کہ خود شریعت کے احکام۔

مثال

جیسے ڈاکٹر مریض کو کچھ چیزیں کھانے کو کہتا ہے مگر اس کے گاؤں میں وہ نہیں ملتیں تو اس میں ڈاکٹر کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ قصور گاؤں والوں کا ہے کہ ضرورت کی چیزیں مہیا نہیں کر رکھیں۔

اور کبھی حقیقت میں شریعت کے احکام میں تنگی نہیں ہوتی، صرف اپنے ذاتی نقصان کے پیش نظر تنگی کا شبہ ہوتا ہے۔ تو ایسا کون سا قانون ہے جس میں عمومی مصلحت کی رعایت کی وجہ سے انفرادی نقصان نہ ہو؟

غلطی ﴿۶﴾

چھٹی غلطی احکام کے بارے میں بعض لوگوں کو یہ لگتی ہے کہ وہ شرعی احکام کی علتیں اپنے ذہن سے

تراش کر احکام کو ان علتوں پر موقوف سمجھتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شریعت کے احکام میں دخل اندازی کرنے لگتے ہیں۔

چنانچہ بعض لوگوں کے بارے میں سنا ہے کہ انہوں نے وضو کی علت محض ''صفائی ستھرائی'' سمجھ کر جب اپنے آپ کو صاف ستھرا دیکھا تو وضو کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور بغیر وضو کے نماز شروع کردی۔اسی طرح روزہ، زکوۃ اور حج میں دخل اندازی کی۔اسی طرح شرعاً ممنوع کاموں میں مثلاً سود اور تصویر وغیرہ میں دخل اندازی کی اور تمام شریعت کو کالعدم کردیا۔

جواب

اس کا الحاد ہونا تو ظاہر ہے۔اس کے علاوہ اس دعوے کی تمام باتیں بلادلیل ہیں۔کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ بہت سے احکام صرف بندگی کے لئے ہوں، ان کی اصل علت بندے کا امتحان ہو کہ حکم پر عمل کرتا ہے یا نہیں؟ اور جو علتیں بیان کی گئی ہیں اس کی کیا دلیل ہے کہ یہی حقیقی علتیں ہیں؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ علت وہ اثرات ہوں جو ان احکام پر عمل کرنے سے ہی حاصل ہوتے ہوں۔جس طرح دواؤں کے خاص اثرات ہوتے ہیں۔پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ایک کی سمجھ میں کچھ آئے اور دوسرے کی سمجھ میں کچھ تو ایک شخص کی رائے کو دوسرے کی رائے پر ترجیح کس بنیاد پر دی جائے گی؟ جب ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں تو ''اِذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا'' یعنی ''جب دو باتوں میں اختلاف ہوجائے تو دونوں کالعدم ہوجاتی ہیں'' کے تحت دونوں کی رائے کالعدم ہوجائے گی۔اور اس کے کالعدم ہونے سے خود احکام ہی کالعدم ہو جائیں گے۔کیا کوئی عقل مند مسلمان اس کا قائل ہوسکتا ہے؟

چھٹی غلطی کی ایک اور قسم

اسی غلطی کی ایک قسم یہ ہے کہ دوسرے مذاہب والوں کے سامنے یہ خودساختہ علتیں بیان کر کے احکام کو ثابت کرتے ہیں۔

جواب

اس میں بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ علتیں محض اندازے پر مبنی ہوتی ہیں اگر ان میں کوئی نقص نکل آئے تو اصل حکم ناقص ٹھہرتا ہے، اور اسلام کے مخالفین کو ہمیشہ کے لئے احکام کو باطل کرنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔

اور اصل بات تو یہ ہے کہ یہ قوانین ہیں اور قوانین میں علتیں نہیں ڈھونڈی جاتیں، اور نہ خود تراشی ہوئی علتوں کی بناء پر کسی کو قانون تبدیل کرنے یا ختم کرنے کا اختیار ہوتا ہے، البتہ خود قانون بنانے والے کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔

اشکال

اگر احکام کی علتیں نکالنا درست نہیں ہے تو پھر مجتہدین نے احکام کی علتیں کیوں نکالیں؟

جواب

مجتہدین نے بعض احکام کی جو علتیں نکالی ہیں وہ اس لئے کہ اس وقت ان چیزوں کا حکم معلوم کرنے کی ضرورت تھی جن کا حکم قرآن وحدیث میں صراحتاً نہیں ملا۔ دوسرا یہ کہ مجتہدین میں اس کی اہلیت اور صلاحیت بھی تھی، جبکہ آج کل یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں، نیز کم علمی کے علاوہ خواہشات کی پیروی بھی اجتہاد کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔

غلطی ⟨۷⟩

ساتویں غلطی جو سب سے بدترین غلطی ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ منکرِ نبوت کی نجات کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے آنے کا مقصد توحید کو بیان کرنا تھا، لہٰذا جو شخص توحید کو مانتا ہو اس کو نبوت کے نہ ماننے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

جواب

کئی آیات اور احادیث سے ثابت ہے کہ منکرِ نبوت ہمیشہ جہنم میں رہے گا، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○﴾ [النساء، آیت: ۱۵۰، ۱۵۱] ترجمہ: ''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں...... یہی لوگ پکے کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کردینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ توحید کے ساتھ ساتھ نبوت کو ماننا بھی ضروری ہے۔

عقلی جواب

جو شخص رسول کو جھٹلاتا ہے وہ دراصل اللہ کو جھٹلاتا ہے۔ کیونکہ وہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ [الفتح، آیت: ۲۹] ترجمہ: ''محمد اللہ کے رسول ہیں۔'' اور اس جیسی دوسری قرآنی آیات کو جھٹلاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا توحید کو ماننے کے لئے نبوت کو ماننا بھی ضروری ہے۔

مثال

اس کی عام سی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص بادشاہ کو تو مانے مگر اس کے نمائندہ کی ہمیشہ مخالفت کرے تو کیا وہ شخص بادشاہ کے نزدیک کسی مقام ومرتبہ کے یا معافی کے لائق ہوسکتا ہے؟

❀...❀...❀

تنبیہ ۴

قرآن

شریعت کے چار اصول ہیں:

۱ کتاب اللہ ۲ حدیثِ رسول ۳ اجماعِ امت ۴ قیاسِ مجتہد

ان سب میں چند غلطیاں کی جارہی ہیں۔ کتاب اللہ کے بارے میں دو غلطیاں ہورہی ہیں۔

غلطی ۱

احکام کو صرف قرآن میں منحصر سمجھتے ہیں، اسی لئے دوسرے اصولوں کا سرے سے انکار کردیتے ہیں۔

جواب

شریعت کے چار اصول ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، ان کو اصولِ اربعہ کہتے ہیں۔
احکام ان چاروں سے ثابت ہوتے ہیں، احکام کو صرف قرآن میں منحصر سمجھنا غلط ہے۔

پہلی غلطی کی ایک ذیلی قسم

احکام کو صرف قرآن میں منحصر سمجھنے سے ایک اور غلطی یہ پیش آتی ہے کہ جس گناہ کے کرنے کو جی چاہتا ہے اس سے منع کرنے پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ قرآن میں منع ہونا دکھاؤ۔ چنانچہ داڑھی کے متعلق ایسے سوالات اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پھر یہ بات فطرت میں ایسی داخل ہوگئی ہے کہ جب کوئی غیر مسلم کسی بات کو قرآن سے ثابت کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ لوگ اس مطالبہ کو صحیح اور اسے ثابت کرنے کو اپنے اوپر لازم سمجھ کر اس کوشش میں لگ جاتے ہیں، اور اگر خود اس پر قادر نہیں ہوتے تو علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ کسی طرح قرآن سے ثابت کردو۔

جواب

اس مطالبہ کی بنیاد یہ ہے کہ احکام کو صرف قرآن میں منحصر سمجھتے ہیں جبکہ یہ خیال ہی غلط ہے، اسی

لئے یہ مطالبہ بھی غلط ہے۔ پھر اس بات میں نہایت ہی بے احتیاطی ہے۔ اس کا انجام خود اسلام کے ارکان کو شرعاً غیر ثابت شدہ ماننا ہے۔ کیا کوئی شخص پانچ نمازوں کی رکعات کی تعداد کو قرآن سے ثابت کر سکتا ہے؟ اور کیا کوئی شخص زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار قرآن سے ثابت کر سکتا ہے؟ اس مطالبہ کا غیر معقول ہونا ایک حسی مثال کے ذریعے سمجھیے۔

حسی مثال

اگر کوئی شخص عدالت میں اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے گواہ پیش کرے تو مدعا علیہ کو اس گواہ پر قانونی جرح کا حق تو حاصل ہے، لیکن اگر گواہ جرح میں سچا ثابت ہو تو مدعا علیہ کو یہ حق نہیں ہے کہ عدالت سے درخواست کرے کہ اگرچہ گواہ معتبر ہے مگر میں تو اس دعوے کو تب تسلیم کروں گا جب اس گواہ کے بجائے فلاں معزز عہدے دار یا فلاں سردار گواہی دے۔ کیا عدالت ایسی درخواست کو قابلِ قبول سمجھے گی؟ لہٰذا جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ فلاں چیز شریعت سے ثابت ہے، اس کو اختیار ہے کہ شریعت کی جس دلیل سے چاہے اس کو ثابت کرے، کسی کو یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا کہ قرآن سے ثابت کرو۔

ہاں یہ حقیقت ہے کہ یہ چاروں دلائل قوت میں برابر نہیں ہیں، لیکن جیسے ان دلائل کی قوت میں فرق ہے ایسے ہی ان سے ثابت ہونے والے احکام کی قوت میں بھی فرق ہے کہ بعض احکام ثبوت اور دلالت دونوں لحاظ سے قطعی ہوتے ہیں، بعض دونوں لحاظ سے ظنی ہوتے ہیں، بعض ثبوتاً قطعی اور دلالۃً ظنی ہوتے ہیں اور بعض ثبوتاً ظنی اور دلالۃً قطعی ہوتے ہیں، لیکن یہ اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے کہ ظنی احکام کو نہ مانے۔ کیا چیف جسٹس کے بہت سارے فیصلے اسی طرح جاری نہیں ہوتے کہ اس مقدمہ کو فلاں دفعہ کے تحت داخل کر دیا ہے اور وہ دفعہ اگرچہ یقینی ہے مگر مقدمے کا اس کے تحت داخل ہونا ظنی ہے، جس کا مطلب ہے اس کا ثبوت تو قطعی ہے لیکن دلالت ظنی ہے، لیکن اس کو نہ ماننے کا جو انجام ہو سکتا ہے وہ ہر شخص جانتا ہے۔

غلطی ۲

دوسری غلطی قرآن کو سائنسی تحقیقات پر مشتمل کرنے کی کوشش کرنا ہے، جیسے آج کل اکثر اخباروں میں اس قسم کے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں کہ جب یورپ والوں کی کوئی سائنسی تحقیق دیکھی یا سنی تو جس طرح بھی ہو سکا اس کو کسی آیت سے ثابت کر دیا، پھر اس کو اسلام کی بڑی خیر خواہی، قرآن کے لئے بڑے فخر کی بات اور اپنی بڑی ذہانت سمجھتے ہیں۔ اس غلطی میں بہت سے اہل علم بھی مبتلاء ہیں۔

جواب

قرآن کو سائنسی تحقیقات پر مشتمل کرنے سے چار خرابیاں پیش آتی ہیں۔

خرابی ①

اس میں ایک خرابی تو یہی ہے کہ قرآن کے سائنسی تحقیقات پر مشتمل ہونے کو قرآن کا کمال سمجھا۔ وجہ اس غلط فہمی کی یہ ہے کہ قرآن کے اصل موضوع کی طرف توجہ نہیں کی۔ قرآن اصل میں نہ سائنس کی کتاب ہے نہ تاریخ کی نہ جغرافیہ کی، یہ تو روح کی اصلاح کرنے والی کی کتاب ہے۔ جس طرح میڈیکل کی کسی کتاب کا کپڑا بنانے اور جوتا بنانے کے طریقوں سے خالی ہونا اس کے لئے عیب کی بات نہیں بلکہ بغیر ضرورت کے ان باتوں پر مشتمل ہونا موضوع سے ہٹنے کی وجہ سے ایک لحاظ سے عیب ہے اور ان سے خالی ہونا کمال ہے۔ اسی طرح قرآن کا جو کہ روحانی اصلاح کی کتاب ہے ان سائنسی تحقیقات سے خالی ہونا اس کے لئے عیب نہیں بلکہ ایک لحاظ سے کمال ہے۔ البتہ اگر روحانی اصلاح کی کسی ضرورت کے پیش نظر کوئی سائنسی بات ذکر کی گئی تو ضرورت کے بقدر ہی کی گئی، ضرورت سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ اصول ہے ''اَلضَّرُوْرَۃُ تَتَقَدَّرُ بِقَدْرِ الضَّرُوْرَۃِ'' یعنی ''ضرورت والی چیز ضرورت کے بقدر ہی ہوتی ہے۔'' چنانچہ توحید جو کہ روح کی اصلاح کے لئے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے، کو ثابت کرنے کا آسان ترین طریقہ مخلوق کی تخلیق کو بیان کرنا ہے۔ اس لئے قرآن میں کہیں کہیں مختصر طور پر آسمان و زمین اور انسان و حیوان کی تخلیق کا ذکر آیا ہے اور چونکہ تفصیل کی ضرورت نہیں تھی اس لئے تفصیل ذکر نہیں کی گئی۔

الغرض سائنسی تحقیقات قرآن کے مقاصد میں سے نہیں ہیں، البتہ اصل مقصد یعنی روح کی اصلاح کی خاطر جو کچھ اس میں قطعی دلالت کے ساتھ مذکور ہے وہ یقیناً اور قطعاً صحیح ہے۔ کسی دوسری دلیل سے اس کے خلاف کسی بات کو ماننا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسری دلیل اس کی خلاف ہوگی تو تحقیق کے بعد وہ دلیل ہی غلط ثابت ہوگی یا دونوں دلیلوں میں مخالفت کا شبہ ہوگا حقیقت میں مخالفت نہیں ہوگی۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے آیت کی دلالت قطعی نہ ہو اور اس کے خلاف قطعی دلالت والی دلیل قائم ہو جائے۔ اس صورت میں آیت کے ظاہری معنیٰ میں تاویل کریں گے۔

خرابی ②

دوسری خرابی یہ ہے کہ اصل مقصد یعنی روح کی اصلاح کے لئے قرآن میں جو دلائل لائے

گئے ہیں، بعض جگہ پر سائنسی باتیں ان دلائل کے اجزاء کے طور پر آئی ہیں، مگر وہ باتیں یا تو عرب میں تسلیم شدہ تھیں یا بالکل واضح تھیں یا دلیل کے ساتھ تسلیم کرادی گئی تھیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ دلیل کے اجزاء ایسے ہونے چاہئیں جو پہلے سے مخاطب کے نزدیک تسلیم شدہ ہوں یا بالکل واضح ہوں یا دلیل کے ساتھ تسلیم کرادیئے گئے ہوں ورنہ ان کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب سمجھنا چاہیے کہ اگر آج کل کی جدید سائنسی تحقیقات ان قرآنی آیات کا مطلب اور مفہوم ہوں اور ظاہر ہے کہ عرب جو قرآن کے پہلے مخاطب تھے وہ ان تحقیقات سے بالکل ناآشنا تھے تو اس سے لازم آتا ہے کہ غیر تسلیم شدہ، غیر واضح اور غیر ثابت شدہ اجزاء کو دلیل بنایا گیا جو دلیل بن ہی نہیں سکتے تھے۔ تو اس سے کلام اللہ کے اندازِ بیان پر کتنا بڑا دھبہ لگے گا؟

خرابی ۳

تیسری خرابی یہ ہے کہ یہ سائنسی تحقیقات غلط بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ان تحقیقات کو قرآن سے ثابت کردیا جائے اور کسی وقت کوئی تحقیق غلط ثابت ہوجائے تو اس وقت ایک ادنیٰ ملحد بھی نہایت آسانی سے قرآن کو جھٹلا سکے گا کہ قرآن کی یہ بات غلط ہے اور جزء کے غلط ہونے سے کل کا غلط ہونا لازم آتا ہے، لہٰذا پورا قرآن غلط ہے۔ اس وقت کتنی مشکل پیش آئے گی؟

اور اگر کوئی شخص یہ کہے جیسا کہ بعض نے دعویٰ بھی کیا ہے کہ قرآن میں یہ کمال ہے کہ جس زمانے میں جو بات ثابت ہو قرآن کے الفاظ اس کے مطابق ہوجاتے ہیں، تو اس صورت میں تو یہ لازم آتا ہے کہ قرآن کا کوئی مفہوم بھی قابلِ اعتبار نہ ہو، ہر مفہوم میں اس کے مخالف کا بھی امکان ہو۔ یہ تو وہی بات ہوگئی جیسے کسی چالاک نجومی کا واقعہ ہے کہ جب اس سے پوچھا جاتا کہ ہمارے ہاں لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ تو وہ کہتا: ''لڑکا نہ لڑکی'' پھر جو بھی واقعہ پیش آتا پیش گوئی کو فوراً اس پر فِٹ کردیتا یعنی لڑکا پیدا ہونے کی صورت میں کہتا: میں نے کہا تھا ''لڑکا، نہ لڑکی'' اور لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں کہتا: میں نے کہا تھا ''لڑکا نہ، لڑکی'' تو کیا ایسی کتاب کو ہدایت نامہ کہنا صحیح ہوگا؟

خرابی ۴

چوتھی خرابی جو کہ غیرت کے بالکل ہی خلاف ہے وہ یہ ہے کہ اس صورت میں اگر یورپی محققین یہ کہیں کہ دیکھو قرآن کو نازل ہوئے اتنا زمانہ گزر گیا ہے مگر آج تک کسی نے حتیٰ کہ خود تمہارے

نبی ﷺ نے بھی قرآن کا صحیح مطلب نہیں سمجھا، ہمارا احسان سمجھو کہ ہماری وجہ سے تمہیں قرآن کا صحیح مطلب سمجھ آیا تو اس کا کیا جواب ہوگا؟

❋...❋...❋

تنبیہ ۵

حدیث

غلطی

حدیث کے بارے میں یہ غلطی کی جاتی ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ حدیثیں محفوظ نہیں ہیں نہ لفظاً نہ معنیً۔ لفظاً اس لئے کہ عہد نبوی میں حدیثیں لکھ کر جمع نہیں کی گئیں صرف زبانی نقل در نقل کی عادت تھی، تو ایسا حافظہ کہ الفاظ تک یاد رہیں فطرت کے خلاف ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث کے الفاظ محفوظ نہیں ہیں۔ اور معنیً اس لئے کہ جب سرورِ عالم ﷺ سے کچھ سنا تو ضرور اس کا کچھ نہ کچھ مطلب بھی سمجھا ہوگا، چاہے وہ آپ ﷺ کی مراد کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اور چونکہ الفاظ لکھ کر محفوظ نہیں کیے تھے تو اسی اپنے سمجھے ہوئے مفہوم کو دوسروں کے سامنے بیان کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی مراد کا محفوظ ہونا بھی یقینی نہیں ہے۔ تو جب نہ الفاظ محفوظ ہیں نہ معانی تو حدیث کس طرح حجت ہوئی؟ فرقہ قرآنیہ کے اعتراض کا خلاصہ بھی یہی ہے۔

جواب

حقیقت میں یہ غلطی محدثین اور فقہائے کرام کے حالات میں غور نہ کرنے سے پیدا ہوئی۔ ان کو اپنی طرح حافظے میں اور رغبت و خشیت میں کمزور سمجھ لیا، حالانکہ ان کا قوتِ حافظہ بہت سارے واقعات سے جو معنیً متواتر ہیں ثابت ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا سو شعر والے قصیدے کو ایک بار سن کر یاد کر لینا۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک ہی مجلس میں خلط ملط متن اور سند والی سو حدیثوں کو سن کر ہر ایک کو غلط قرار دینا، پھر ان سب کو ہو بہو اسی طرح غلط سنانا، پھر ہر ایک کو صحیح کر کے سنانا۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا نابینا ہو جانے کے بعد ایک درخت کے نیچے سے سر جھکا کر گزرنا اور وجہ دریافت کرنے پر وہاں درخت ہونے کا بتانا جو کہ اس وقت نہیں تھا اور تحقیق کے بعد اس بات کا درست ثابت ہونا۔ اور محدثین کا اپنے اساتذہ کے امتحان کے لئے وقتاً فوقتاً احادیث دوبارہ سننا اور ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہ

پانا۔ یہ سب واقعات سیرت، تاریخ اور اسماء الرجال کی کتابوں میں مذکور ہیں جو قوتِ حافظہ کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسی طرح اسماء الرجال کی مدد سے کمزور حافظے والے راویوں کی روایات کو صحیح روایات سے الگ کرنا بھی بڑی حجت ہے۔ اس حوالے سے محدثین نے بہت محنت کی ہے۔

اور قوتِ حافظہ کے علاوہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ کام لینا تھا اس لئے غیبی طور پر اس سلسلے میں ان کی مدد کی گئی۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قصہ احادیث میں موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ کلمات پڑھ کر ان کی چادر میں دم کیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے وہ چادر اپنے سینے سے لگالی، اس کے بعد وہ کبھی حدیث نہیں بھولے۔ [صحیح بخاری، حدیث: ۷۳۵۴]

اعتراض ①

یہاں پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کے حجت ہونے پر بحث ہورہی ہے اور پھر اس کو ثابت کرنے کے لئے دلیل بھی حدیث سے دی جارہی ہے۔

جواب

بحث احکام کی حدیثوں کے متعلق ہورہی ہے جبکہ یہ حدیث ایک قصے پر مشتمل ہے۔ ایسی احادیث علمِ تاریخ کی اقسام میں سے ہیں، جو بلا اختلاف حجت ہیں۔

اعتراض ②

دوسرا اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ یہ قصہ خلافِ فطرت معلوم ہوتا ہے۔

جواب

خلافِ فطرت اس لئے معلوم ہوتا ہے کیونکہ کبھی اس طرح ہوتا دیکھا نہیں، لیکن کسی چیز کو نہ دیکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز محال ہو۔ لہٰذا یہ ممکن ہوا، اور اس ممکن کے واقع ہونے کی خبر سچے شخص نے دی ہے، اس لئے اس کو ماننا ضروری ہے۔

پھر اس کو خلافِ فطرت کہنے پر ہمیں اعتراض ہے۔ اس لئے کہ مسمریزم والے خیالات پر ایسا اثر کردیتے ہیں کہ غائب چیزیں نظر آنے لگتی ہیں اور موجود چیزیں غائب ہوجاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل بھی اسی طرح تھا بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ اسے بالکل خلافِ فطرت کہنا صحیح نہیں ہے۔ اور اگر مان بھی لیا جائے تو یہ معجزہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ہاتھوں ظاہر کروایا۔

اس کے علاوہ ہم نے اپنے قریبی زمانے میں بھی ایسے حافظے والے لوگوں کے بارے میں سنا ہے۔ آپ نے بھی اپنے قریبی زمانے میں ایسے ذہین وفطین لوگوں کے بارے میں سنا ہوگا۔ جیسے زمانۂ

قریب کے بزرگ عالمِ دین امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حافظے کے واقعات مشہور ہیں۔

حدیث کو بعینہٖ آگے پہنچانے کا شوق اور ردو بدل کرنے سے احتیاط

یہ تو حافظے کا عالم تھا اور یاد کر کے بعینہٖ آگے پہنچانے کا شوق اس لئے تھا کہ جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے شخص کے لئے یہ دعاء دی ہے: ''نَضَّرَ اللهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَ'' [جامع ترمذی، حدیث: ۲۶۵۷] ترجمہ: ''اللہ اس شخص کو خوش وخرم رکھے جو ہم سے کوئی بات سنے، پھر جیسے سنا تھا ویسے ہی آگے پہنچائے۔'' اس دعاء کے پیش نظر وہ حضرات پوری کوشش کرتے تھے کہ بغیر کسی ردو بدل کے بعینہٖ حدیث کو آگے پہنچائیں۔ اور حدیث میں ردو بدل کرنے سے وہ اس لئے بھی ڈرتے تھے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سنا تھا: ''مَنْ يَّقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ اَقُلْ فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ'' [صحیح بخاری، حدیث: ۱۰۹] ترجمہ: ''جس شخص نے میری طرف ایسی بات کی نسبت کی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔'' حتیٰ کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم خوف کی وجہ سے حدیث بیان ہی نہیں کرتے تھے۔

پھر محدثین کا لمبی احادیث کے بعض اجزاء کو متعدد الفاظ سے بیان کرنا اور ''نحوہ'' وغیرہ کہنا الفاظ کو اہتمام سے یاد کرنے اور احتیاط کرنے کی واضح دلیل ہے۔ ایسے دور میں حدیثوں کا نہ لکھا جانا بالکل نقصان دہ نہیں تھا۔ بلکہ غور کرنے سے مفید معلوم ہوتا ہے کیونکہ لکھے ہوئے پر اعتماد کرنے سے حافظے کا استعمال کم ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ان پڑھ لوگوں کو پرانے پرانے حساب کتاب زبانی سناتے ہوئے دیکھا ہے جبکہ پڑھے لکھے لوگوں کو بغیر لکھے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اِس دور میں لوگوں کے کمزور حافظے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

دوسری بات وہ ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ کام لینا تھا۔ اور اب احادیث کی تدوین اور احکام کی تدوین جو کہ تدوینِ احادیث کا پھل تھا کی ضرورت پوری ہو گئی ہے۔ اور قدرتاً یہ ہوتا چلا آرہا ہے کہ جس وقت جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق قوتیں پیدا کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ اِس وقت ایجادات کے مطابق دماغوں کا پیدا ہونا، اِس کی تائید کرتا ہے۔ اس وقت حدیث نہ لکھنے کی حکمت یہ تھی کہ قرآن وحدیث آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ جب یہ اندیشہ ختم ہو گیا اور مختلف فرقے وجود میں آ گئے تو اس وقت حدیثوں کو جمع کرنا زیادہ محتاط اور دینی کاموں کے لئے زیادہ مددگار طریقہ تھا، اس لئے اس وقت نہایت احتیاط سے حدیثیں جمع کی گئیں۔

چنانچہ اسماء الرجال کی کتابوں کو گہری نظر کے ساتھ دیکھنے سے پوری طرح یقین ہوجاتا ہے کہ نبی ﷺ کے ارشادات اور اعمال بغیر کسی ردوبدل کے محفوظ ہوگئے ہیں۔ اور یہ بات اخبار آحاد میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور اگر حدیث کی کتابوں کو جمع کر کے ان کے متنوں اور سندوں کو دیکھا جائے تو اکثر متنوں میں یکسانیت اور سندوں میں کثرت نظر آئے گی جس سے وہ احادیث متواتر ہوجاتی ہیں اور متواتر روایات میں شبہات کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

اب حدیث کی حجیت ثابت ہونے کے بعد یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس پر درایت سے تنقید کرنا غلط ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ دلالت اور ثبوت کے لحاظ سے ظنی ہو جبکہ درایت عقلی ظنی دلیل کو کہتے ہیں۔ اور دلیلِ نقلی ظنی، دلیلِ عقلی ظنی پر مقدم ہوتی ہے۔

جہاں تک روایت بالمعنیٰ کی بات ہے تو اول تو بلا ضرورت اس کی عادت نہیں تھی اور ان کے مضبوط حافظے کی وجہ سے اس کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ پھر اکثر احادیث کو مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے، ایک نے روایت بالمعنیٰ کیا تو دوسرے نے روایت باللفظ کر دیا ہے۔ پھر دونوں روایتوں کے معنیٰ ایک جیسے ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ جنہوں نے روایت بالمعنیٰ کیا ہے انہوں نے اکثر صحیح ہی سمجھا ہے۔ اور یقیناً جو خوفِ خدا سے کام لے گا وہ معنیٰ کے سمجھنے میں بھی احتیاط کرے گا اور اچھی طرح تسلی کیے بغیر مطمئن نہیں ہوگا۔

اور اگر کہیں الفاظ بالکل ہی محفوظ نہ رہے ہوں اگر چہ ایسا شاذ و نادر ہی ہے، تو پھر بھی ظاہر ہے کہ آدمی کا قریبی اور مزاج شناس دوست جس طرح اس کی بات کو موقع محل کی مناسبت سے سمجھ سکتا ہے دوسرا ہر گز نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے قرآن وحدیث کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی سمجھ جتنی قابلِ بھروسہ ہے دوسروں کی اتنی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ دوسرے لوگوں کا ان کے خلاف قرآن سے یا محض اپنی عقل سے کچھ سمجھنا اور اس کو مخالفِ حدیث درایت قرار دے کر حدیث کو رد کرنا کیسے قابلِ قبول ہوسکتا ہے؟

ان تمام چیزوں کے بعد اگر کسی شبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے تو وہ بعض احادیث کی قطعیت کے بارے میں ہوسکتی ہے۔ سو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ایسی احادیث سے قطعی احکام ثابت نہیں ہوں گے، بلکہ ظنی احکام ثابت ہوں گے، لیکن ظنی احکام بھی چونکہ دین کا جزء اور واجب العمل ہیں اس لئے ظنیت سے بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

❀...❀...❀

تنبیہ ۶

اجماع

غلطی

اجماع میں یہ غلطی کی جاتی ہے کہ اس کا مرتبہ رائے سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا، اس لئے اسے حجت قرار نہیں دیا جاتا۔

جواب

اجماع کا حجت ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اس لئے کہ جب ہم نے قرآن وحدیث کی طرف رجوع کیا تو یہ قانون پایا کہ جس بات پر کسی زمانے کے علماء کا اتفاق ہوجائے تو اس کو ماننا ضروری ہے، اور اس کے ہوتے ہوئے اپنی رائے پر عمل کرنا گمراہی ہے، خواہ وہ مسئلہ عقیدے سے متعلق ہو یا عمل سے۔[النساء، آیت:۵۹، ۱۱۵][مسند احمد، حدیث نمبر: ۳۶۰۰، ۲۱۵۶۱] نیز جس طرح قانون کی کوئی کتاب حجت ہو تو اس کی تمام دفعات واجب العمل ہوتی ہیں اسی طرح جب قرآن وحدیث حجت ہیں تو ان کے بھی تمام قوانین واجب العمل ہوں گے، اور ان قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اجماع قطعی حجت ہے، تو اس قانون پر بھی عمل کرنا واجب ہوگا اور اس کی مخالفت قرآن وحدیث کی مخالفت ہوگی۔ اور اگر یہ بات قرآن وحدیث سے ثابت نہ بھی ہوتی تب بھی عقل ہمیں اسی بات پر مجبور کرتی ہے، کیونکہ جب ہم اپنے معاملات میں اکثریت کی رائے کو انفرادی رائے پر ترجیح دیتے ہیں اور اکثریت کی رائے کے مقابلے میں انفرادی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تو اجماع تو اکثریت کی رائے سے بڑھ کر ہے یعنی علمائے امت کی متفقہ رائے ہے، تو اس کی حیثیت انفرادی رائے کے برابر یا اس سے کم کیسے ہوسکتی ہے؟

سوال

بے شک انفرادی رائے کی اجماع کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن اگر ہم اس اجماع کے خلاف دوسری رائے پر اتفاق کرلیں تو یہ متفقہ رائے اس اجماع کے مدِمقابل بن سکتی ہے یا نہیں؟

جواب

کسی بھی فن میں ہر قسم کے لوگوں کا اتفاق معتبر نہیں ہوتا، بلکہ ہر فن میں اس کے ماہرین کا اتفاق معتبر ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم اپنی دینی حالت کا سلفِ صالحین کی حالت سے انصاف کے ساتھ مقابلہ

کریں تو اپنے آپ کو علم و عمل دونوں میں ان سے بہت پیچھے پائیں گے۔ اس لئے ان کے خلاف ہمارا اتفاق ایسے ہی غیر معتبر ہوگا جیسے اناڑیوں کا ماہرین کے خلاف۔ البتہ جس مسئلے میں سلفِ صالحین سے کچھ منقول نہ ہو اس میں وقت کے علماء کا اتفاق معتبر ہوگا۔

اور اس میں ایک فطری راز یہ ہے کہ اللہ کا دستور ہے کہ خواہش پرستی کے ساتھ اللہ کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اخلاص کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لئے جب کسی مسئلے میں سلفِ صالحین کا اجماع موجود ہو جو کہ حجت ہے تو اس کے ہوتے ہوئے اپنی رائے پر عمل کرنا خواہش پرستی کی وجہ سے ہوگا، اس لئے اللہ کی تائید ساتھ نہیں ہوگی۔

اور جس مسئلے میں اجماع نہ ہو اس میں اجتہاد کرنا اور پھر اتفاق کرنا دینی ضرورت کی وجہ سے ہوگا اور دینی ضرورت کے تحت کوئی کام کرنا اخلاص کی نشانی ہے اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید ہوتی ہے چنانچہ اللہ کی تائید ساتھ ہونے کی وجہ سے وہ اتفاق معتبر ہوگا۔

یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے جب سلف کا اجماع رائے پر ہوا ہو اگرچہ وہ رائے بھی قرآن و حدیث سے ماخوذ ہوگی لیکن صریح آیت یا حدیث نہیں تھی۔

اور اگر کسی صریح آیت یا حدیث کے مفہوم پر اجماع ہوا ہو تو اس کی مخالفت صریح آیت یا حدیث کی مخالفت ہوگی۔

سوال

جس آیت یا حدیث پر اجماع ہوا ہے اس کے مخالف کوئی دوسری صریح آیت یا حدیث موجود ہو تو کیا اس وقت اس اجماع کی مخالفت جائز ہے یا نہیں؟

جواب

تب بھی جائز نہیں کیونکہ کہ دونوں آیت یا حدیث قوت میں برابر ہیں اور ایک کو اجماع کی وجہ سے مزید قوت حاصل ہوگئی اور قوی دلیل کے ہوتے ہوئے ضعیف دلیل پر عمل کرنا نقل اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

نیز حدیث شریف سے اجماعِ امت کا گمراہی نہ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اِنَّ اللهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّتِيْ أَوْ قَالَ: أُمَّةَ مُحَمَّدٍ عَلٰى ضَلَالَةٍ'' [جامع ترمذی، حدیث: ۲۱۶۷] ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو یا فرمایا محمد کی امت کو گمراہی پر جمع نہیں ہونے دیں گے۔'' اس لئے اگر اجماع کا ماخذ کوئی صریح آیت یا حدیث نہ ہو جبکہ اس کے خلاف کوئی آیت یا حدیث موجود ہو تب بھی

اجماع کو یہ سمجھ کر مقدم رکھا جائے گا کہ اجماع کے وقت سلفِ صالحین کے سامنے کوئی آیت یا حدیث ہوگی جو نقل نہیں ہوسکی۔ کیونکہ آیت یا حدیث کی مخالفت کرنا گمراہی ہے اور اجماع کا گمراہی ہونا محال ہے، لہٰذا اس اجماع کا آیت یا حدیث کے مخالف ہونا بھی محال ہے۔ بس لامحالہ یہ اجماع دوسری آیت یا حدیث کے مطابق ہوگا، اور جس آیت یا حدیث کے مطابق ہوگا وہ اجماع کی وجہ سے دوسری آیت یا حدیث پر مقدم ہوگی۔ لہٰذا دراصل آیت یا حدیث ہی آیت یا حدیث پر مقدم ہے اور اجماع اس آیت یا حدیث کے موجود ہونے کی علامت ہے۔ اس بات کو مثالوں کے ذریعے سمجھیے۔

مثال (۱)

بغیر سفر اور بغیر کسی عذر کے دو نمازوں کو ایک وقت میں ایک ساتھ پڑھنا۔ یہ حدیث ترمذی میں موجود ہے۔ [جامع ترمذی، حدیث: ۱۸۷] لیکن اجماع اس کے خلاف پر ہے کہ بغیر سفر اور بغیر کسی عذر کے دو نمازوں کو ایک وقت میں ایک ساتھ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اس اجماع کی بنیاد دوسری حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے کسی عذر کے بغیر دو نمازیں ایک ساتھ پڑھنے کو گناہِ کبیرہ قرار دیا ہے۔ یہ حدیث بھی ترمذی میں موجود ہے۔ [جامع ترمذی، حدیث: ۱۸۸] اجماع کی وجہ سے یہ حدیث زیادہ قوی ہوگئی ہے، اس لئے اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

مثال (۲)

صبح کی سرخی ظاہر ہونے تک سحری کرنے کی اجازت دینا۔ یہ حدیث بھی ترمذی میں موجود ہے۔ [جامع ترمذی، حدیث: ۷۰۵] لیکن اجماع اس کے خلاف پر ہے کہ صبح صادق ظاہر ہونے کے بعد سحری کرنا جائز نہیں ہے۔ اس اجماع کی بنیاد دوسری حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے صبح صادق کے ظاہر ہونے کو سحری کا آخری وقت قرار دیا ہے۔ [جامع ترمذی، حدیث: ۷۰۶] اجماع کی وجہ سے یہ حدیث زیادہ قوی ہوگئی ہے، اس لئے اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

❀...❀...❀

تنبیہ (۷)

قیاس

قیاس کی تعریف

قیاس کی تعریف یہ ہے کہ جس چیز کا حکم قرآن وحدیث اور اجماع میں صراحتاً بیان نہ کیا گیا ہو اس چیز کے پوشیدہ حکم کو معلوم کرنا۔

ظاہر ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے متعلق شریعت میں کوئی حکم نہ ہو خواہ وہ چیز آخرت سے متعلق ہو یا دنیا سے۔ تو جس چیز کا حکم قرآن وحدیث اور اجماع میں صراحتاً بیان نہ کیا گیا ہو اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ حکم تو اس کا بھی شریعت میں موجود ہے مگر پوشیدہ ہے۔ اب اس پوشیدہ حکم کو معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی۔

اس کا طریقہ شریعت نے یہ بتایا ہے کہ جن چیزوں کا حکم قرآن وحدیث میں مذکور ہے ان میں غور کر کے دیکھو کہ یہ چیز جس کا حکم پوشیدہ ہے، صفات اور کیفیات میں ان میں سے کس چیز کے زیادہ مشابہ ہے؟ پھر یہ دیکھو کہ جن چیزوں کا حکم قرآن وحدیث میں مذکور ہے ان کے حکم کی بنیاد غالب گمان کے مطابق کونسی صفت اور کیفیت ہے؟ پھر دیکھو کہ وہ صفت وکیفیت اس چیز میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اگر پائی جاتی ہے تو اس چیز پر بھی وہی حکم لگایا جائے گا۔

جس چیز کا حکم قرآن وحدیث میں مذکور ہو اس کو مقیس علیہ، جس کا حکم پوشیدہ ہو اس کو مقیس، حکم کی بنیاد کو علت اور حکم ثابت کرنے کو قیاس اور تعدیہ کہتے ہیں۔ یہ ہے وہ قیاس جس کی شریعت نے اجازت دی ہے اور جسے اصولیین نے بیان کیا ہے۔ دراصل یہاں پر قرآن وحدیث نے ہی حکم لگایا ہے قیاس نے محض اس کو ظاہر کیا ہے۔ آج کل قیاس میں کئی غلطیاں کی جا رہی ہیں۔

غلطی ﴿۱﴾

پہلی غلطی قیاس کی تعریف میں کی جاتی ہے، چنانچہ آج کل جس چیز کو قیاس کا نام دیا جاتا ہے وہ نری رائے ہے جو قرآن وحدیث سے ماخوذ نہیں ہے۔ اس بات کو وہ خود بھی مانتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں:

''ہمارا یہ خیال ہے۔''

جواب

یہ تو مستقل صاحبِ شریعت یعنی رسول ہونے کا دعویٰ ہے، جو عقل کے لحاظ سے بھی قابلِ مذمت ہے اور اس کی مذمت قرآن وحدیث اور اکابرین کے اقوال میں بھی آئی ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۷۳۴۲] لہٰذا عقل اور نقل دونوں لحاظ سے یہ قابلِ مذمت ہے۔ قیاس کی تعریف یہ ہے کہ جس چیز کا حکم قرآن وحدیث اور اجماع میں صراحتاً بیان نہ کیا گیا ہو اس چیز کے پوشیدہ حکم کو معلوم کرنا۔

غلطی ﴿۲﴾

دوسری غلطی قیاس کے موقع محل میں ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بلاضرورت قرآن وحدیث میں ذکر کیے گئے حکم کی علت نکال کر حکم کو اس علت کے ساتھ مقید کر دیتے ہیں کہ اگر یہ علت پائی جائے گی تو یہ حکم

لاگو ہوگا ورنہ نہیں۔

جواب

قرآن وحدیث میں ذکر کیے گئے کسی حکم کی علت نکالنا صرف اس وقت جائز ہے جب کسی ایسی چیز کا حکم معلوم کرنا ہو جس کا حکم قرآن وحدیث اور اجماع میں صراحتاً مذکور نہ ہو۔ اس کے علاوہ جائز نہیں ہے۔

غلطی ۳

اسی سے ایک تیسری غلطی بھی معلوم ہوگئی جو قیاس کے مقصد میں ہوتی ہے، وہ یہ کہ قرآن وحدیث میں بیان کیے گئے حکم میں ردوبدل کرنے کے لئے قیاس کرتے ہیں۔

جواب

جن چیزوں کا حکم قرآن وحدیث میں صراحتاً مذکور نہ ہو ان کا حکم معلوم کرنے کے لئے قیاس کیا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں بیان کیے گئے حکم میں ردوبدل کرنے کے لئے قیاس کرنا بالکل ناجائز ہے۔

غلطی ۴

چوتھی غلطی قیاس کے اہل میں کی جاتی ہے، یعنی ہر شخص کو اس کا اہل سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ بعض بے باک لوگوں نے اپنے لیکچروں میں کہا ہے کہ آیت ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ [الکافرون، آیت: ٦] ترجمہ: ''تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔'' نے اجتہاد کو ہر شخص کے لئے عام کر دیا ہے۔

جواب

آیت مبارکہ ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہر شخص اجتہاد کا اہل ہے، البتہ اصولیین نے مضبوط دلائل کے ساتھ اجتہاد کی شرائط کو بیان کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہوسکتا۔ اور ظاہری بات ہے کہ ہر شخص میں اس کی اہلیت نہیں ہوسکتی کیونکہ قیاس و اجتہاد کی مثال ایسے ہے جیسے وکلاء کا کسی مقدمے کو کسی دفعہ کے تحت داخل کرنا۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص اس کا اہل ہو تو وکالت پاس کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ جس طرح یہاں شرائط ہیں کہ قانون پڑھا ہوا ہو، یاد بھی ہو، اس کا مقصد بھی سمجھا ہو اور مقدمے کے پوشیدہ پہلوؤں کو بھی جانتا ہو تب اس بات کا اہل ہوتا ہے کہ یہ بتائے کہ یہ مقدمہ فلاں دفعہ کے تحت داخل ہے، اسی طرح یہاں سمجھیے۔

سوال

اس دور میں اجتہاد کی اہلیت رکھنے والا شخص پایا جاتا ہے یا نہیں؟

جواب

اگر فرض کرلیا جائے کہ ایسا شخص اب بھی پایا جاتا ہے تب بھی سلامتی اسی میں معلوم ہوتی ہے کہ اپنے اجتہاد وقیاس پر اعتماد نہ کرے، کیونکہ ہمارے اندر خواہش پرستی اور سہولت پسندی غالب ہے۔ اگر اجتہاد کرے گا تو تقریباً یقینی بات ہے کہ طبیعت کا میلان ہمیشہ خواہشات اور سہولت کی طرف ہوگا، اور پھر اس کو دیکھ کر نااہل لوگ بھی اجتہاد کرنے لگیں گے، اس سے دین کا کس قدر نقصان ہوگا۔

حسی مثال

اس کی حسی مثال یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے ججوں کے فیصلوں کے مقابلے میں کسی کو حتیٰ کہ ماتحت عدالتوں کے ججوں کو بھی اپنی سمجھ کے مطابق قانونی دفعات کی تشریح کرنے کی اجازت صرف اس لئے نہیں ہوتی کہ سپریم کورٹ کے ججوں کو سب سے زیادہ قانون کو سمجھنے والا مانا گیا ہے۔ اور اگر ان کی مخالفت کی اجازت دے دی جائے تو ہر شخص قانون کی من پسند تشریح کر کے ملک میں انتشار اور بدنظمی پھیلانے کا سبب بنے گا۔ بس یہی نسبت ہمیں اپنے اور مجتہدین کے درمیان سمجھنی چاہیے۔

قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کے متعلق غلطیوں کا خلاصہ

چاروں اصولوں سے متعلق غلطیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کو حجت بھی مانا اور ثابت بھی مانا مگر اس کی دلالت میں غلطی کی، یعنی اس کے مفہوم کو غلط سمجھا۔ اور حدیث کو حجت مانا مگر ثبوت میں غلطی کی یعنی حدیث کے ثابت ہونے میں شبہات نکال لئے اس لئے دلالت سے بحث ہی نہیں کی۔ اور اجماع کو حجت ہی نہیں مانا۔ اور قیاس کی جگہ ایک اور گھڑی ہوئی چیز یعنی ''رائے'' کو احکام ثابت کرنے کے لئے معیار قرار دے دیا۔

❀...❀...❀

تنبیہ ⑧

فرشتے، جنات اور ابلیس

فرشتے، جنات اور ابلیس کے متعلق چند غلطیاں کی جا رہی ہیں۔

غلطی ①

فرشتے، جنات اور ابلیس کا وجود جو کہ قرآن وحدیث اور اجماع سے ثابت ہے اس کا انکار کبھی صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ اگر یہ موجود ہوتے تو نظر آتے۔

غلطی ②

کبھی اس بناء پر ان کا انکار کیا جاتا ہے کہ کسی چیز کا اس طرح موجود ہونا کہ سامنے سے گزر جائے اور محسوس بھی نہ ہو سمجھ میں نہیں آتا۔

دونوں غلطیوں کا الزامی جواب

تمہارے نزدیک مادہ موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے ایک جوہر کی شکل میں تھا جسے تم ''مادہ سدیمیہ'' اور ''اثیریہ'' کہتے ہو، لیکن کبھی تم نے اس جوہر کو دیکھا نہیں اور نہ اس کی حقیقت پوری طرح سمجھ آتی ہے۔ جب تم اس جوہر کو بغیر دیکھے اور بغیر سمجھے مانتے ہو تو ان جواہر کو بغیر دیکھے اور سمجھے کیوں نہیں مانتے؟

پہلی غلطی کا تحقیقی جواب

کسی چیز کے موجود ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ نظر بھی آئے، کیونکہ صرف مشاہدہ علم کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ سچے شخص کی خبر اور عقل بھی علم کا ذریعہ ہیں، اور یہاں پر سچے شخص کی خبر یعنی آیات و احادیث موجود ہیں، لہٰذا ان کو ماننا ضروری ہے۔

دوسری غلطی کا تحقیقی جواب

کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا الگ بات ہے اور اس کا عقلاً محال ہونا الگ بات ہے۔ کسی چیز کے سمجھ میں نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عقلاً محال ہو۔ بس جب ان کے محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے تو یہ عقلاً ممکن ہوئے۔ اور جن ممکنات کے موجود ہونے پر صحیح نقلی دلیل قائم ہو جائے ان کے وجود کو ماننا ضروری ہوتا ہے۔ اور قرآن وحدیث میں جا بجا ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کے وجود کو ماننا ضروری ہے۔

غلطی ③

چونکہ قرآن میں جا بجا ان کا ذکر کیا گیا ہے اور قرآن کے قطعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اس لئے ان آیات میں ایسی دور دراز کی تاویلیں کی جاتی ہیں جو تحریف کی حدود میں داخل ہوتی ہیں۔

جواب

قرآنی آیات میں ظاہری معنیٰ مراد لینا اصل ہے، بغیر کسی مجبوری کے ان میں تاویلیں کرنا جائز نہیں ہے، اور یہاں پر کوئی مجبوری ہے نہیں اس لئے ان آیات میں تاویلیں کرنا باطل ہے۔

❀...❀...❀

تنبیہ ⑨

قبر کے حالات اور آخرت کے موجودات
یعنی جنت، جہنم، پل صراط اور میزان

غلطی

ایک غلطی تو یہ کی جاتی ہے کہ قبر کے حالات اور آخرت کے موجودات یعنی جنت، جہنم، پل صراط اور میزان کا انکار اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ ہم نے انہیں دیکھا نہیں ہے۔

جواب

کسی چیز کو نہ دیکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز موجود ہی نہ ہو، کیونکہ صرف دیکھنا علم کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ سچے شخص کی خبر اور عقلی دلیل بھی علم کا ذریعہ ہیں۔ یہاں پر سچے شخص کی خبر یعنی آیات و احادیث موجود ہیں، اس لئے انہیں ماننا ضروری ہے۔

جدید اور قدیم شبہات

بعض لوگوں نے کچھ اور شبہات بھی نکالے ہیں جن میں سے کچھ جدید ہیں اور کچھ قدیم۔

شبہ ①

جب قبر میں جسم میں روح نہیں رہتی تو پھر اس کو راحت اور تکلیف کا احساس کیسے ہوتا ہے؟

شبہ ②

مردہ بغیر کان کے کیسے سنتا ہے؟اور بغیر زبان کے جواب کیسے دیتا ہے؟

شبہ ③

جنت اور جہنم کہاں ہیں؟ جتنی ان کی وسعت بیان کی جاتی ہے وہ کون سی جگہ میں سما سکتے ہیں؟

شبہ ④

اتنے باریک پل صراط پر چلنا کس طرح ممکن ہے؟

شبہ ⑤

جب اعمال کا جسم ہی نہیں ہے تو ان کو میزان میں کیسے تولا جائے گا؟

مشترکہ جواب

ان سب شبہات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح ہونا عجیب معلوم ہوتا ہے، اور عجیب ہونے سے محال ہونا لازم نہیں آتا۔ اور جب محال نہیں تو عقلاً یہ سب چیزیں ممکن ہوئیں اور قرآن وحدیث نے ان کے واقع ہونے کی خبر دی ہے، لہٰذا ان کو ماننا ضروری ہے۔

الگ الگ جوابات

اب ان سب شبہات کے الگ الگ جوابات ذکر کیے جاتے ہیں۔

پہلے شبہ کا جواب

ممکن ہے جسم میں اتنی روح موجود رہتی ہو جس سے وہ راحت اور تکلیف کو محسوس کرتا ہو اور دنیا کی چیزوں سے متاثر نہ ہوتا ہو اور برزخ کے حالات کی وجہ سے حرکت نہ کرتا ہو، جیسے ایک شخص نے مجھے بتایا کہ پیشاب رک جانے کے علاج کے دوران اسے بے ہوش کر کے سلائی چڑھائی گئی تو سلائی چڑھانے کی تکلیف اسے بالکل محسوس نہیں ہوئی البتہ ایک عجیب قسم کی گھٹن سے دل گھبراتا تھا مگر حرکت نہیں ہوسکتی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جسم کو راحت وتکلیف نہ ہوتی ہو بلکہ روح جہاں پر موجود ہے وہاں اس پر سب کچھ گزرتا ہو۔

باقی یہ کہ روح کہاں ہے؟ ممکن ہے کہ وسیع فضا کے کسی حصے میں ہو اور وہی عالمِ ارواح کہلاتا ہو۔ اور اس بات سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ اگر جسم جل جائے یا کوئی جانور کھا لے تو اس صورت میں عذاب وغیرہ کیسے ہوگا؟

دوسرے شبہ کا جواب

اول تو سننے اور بولنے کے لئے ان اعضاء کا ہونا عقلی شرط نہیں ہے بلکہ صرف عادت ہے۔ اور عقل اور عادت دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اُس جہاں کی عادت اِس جہاں سے مختلف ہو یعنی اُس جہاں میں سننے اور بولنے کے لئے اِن اعضاء کا ہونا ضروری نہ ہو۔ دوسرا ممکن ہے کہ وہاں روح کو کوئی اور بدن اُس جہاں کے مطابق مل جاتا ہو اور اُس بدن میں بھی ایسے ہی اعضاء ہوں، جیسے کہ بعض اہلِ کشف اس کے قائل ہیں اور اس کا نام جسمِ مثالی رکھا ہے۔

تیسرے شبہ کا جواب

اس وسیع وعریض کائنات میں جسے موجودہ فلاسفہ اور سائنس دان لامحدود مانتے ہیں جنت جہنم کا ہونا کونسی ناممکن چیز ہے؟

چوتھے شبہ کا جواب

اتنے باریک پل صراط پر چلنا اگرچہ عجیب معلوم ہوتا ہے مگر اس سے محال ہونا لازم نہیں آتا۔

پانچویں شبہ کا جواب

میزان میں عمل کا تولا جانا اس طرح ممکن ہے کہ اعمال جن صحیفوں میں لکھے جاتے ہیں وہ صحیفے تولے جائیں گے۔ وہ صحیفے اجسام ہیں، جیسے کہ بعض احادیث میں اعمال کے وزن کا ذکر کرتے ہوئے ''بِطَاقَةٌ'' اور ''اَلسِّجِلَّاتُ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۳۰۰] جن کے معنیٰ ''کاغذ کا ٹکڑا'' اور ''رجسٹر'' کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیفوں کا وزن کیا جائے گا، لہٰذا وزن تو حقیقتاً ہوا البتہ وزن کی نسبت مجازاً صحیفوں کی بجائے اعمال کی طرف کر دی۔ احادیث میں غور کرنے سے یہ امکان زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس دور میں جب درجۂ حرارت کو بھی ناپا جا رہا ہے، اعمال کے وزن کیے جانے پر اعتراض کرنا خود عجیب لگتا ہے۔

اسی طرح اعضاء کا بولنا بھی خلافِ عادت ہونے کی وجہ سے عجیب معلوم ہوتا ہے عقلاً محال نہیں ہے اور جب سے کمپیوٹر کو بولتے ہوئے دیکھا ہے تب سے اعضاء کے بولنے کو عجیب کہنا بھی بے جا لگتا ہے۔

❋...❋...❋

تنبیہ ⑩

بعض طبعی چیزیں

اگرچہ طبعی چیزوں سے بحث کرنا شریعتِ مطہرہ کا مقصد نہیں ہے جیسا کہ تمہید میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، مگر شریعت کے مقصد کو مکمل کرنے کے لئے ضمناً کچھ طبعی بحثیں مختصر طور پر اس میں ذکر بھی کی گئی ہیں۔ اگرچہ ہمیں ان کی پوری تحقیق کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ وہ شریعت کا مقصد نہیں ہیں، لیکن جتنی اور جس طرح وہ قرآن وحدیث میں ذکر کی گئی ہیں اس کے خلاف عقیدہ رکھنا یا دعویٰ کرنا چونکہ سچے کلام کو جھٹلانا ہے اس لئے جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ہم ایسے عقائد اور دعووں کو جھٹلانا ضروری سمجھیں گے۔ نمونے کے طور پر کچھ مثالیں بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

مثال ①

پہلے انسان کی مٹی سے پیدائش قرآن وحدیث میں صراحتاً بیان کی گئی ہے۔ [السجدہ، آیت: ۷۔ المومنون، آیت: ۱۲۔ الانعام، آیت: ۲۔ الصافات، آیت: ۱۱] اس بارے میں نظریۂ ارتقاء کے پیش نظریہ کہنا کہ بندر ترقی کر کے انسان بن گیا جیسا کہ ڈارون کا وہم ہے یقیناً غلط ہے، اس لئے کہ قرآن و حدیث میں پہلے انسان کا مٹی سے پیدا ہونا صراحتاً آیا ہے، اور کوئی عقلی دلیل اس کے خلاف نہیں ہے نہ ڈارون کے پاس، جیسا کہ اس کی تحریر سے ظاہر ہے کہ محض اندازے سے یہ نظریہ قائم کیا ہے۔ اور نہ ڈارون کے ماننے والوں کے پاس، جیسا کہ ان کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض ڈارون کی پیروی میں ایسے کہتے ہیں، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی پیروی بھی نامکمل ہے اصل میں بھی اور فرع میں بھی۔ اصل میں تو اس طرح کہ اس کو اس مضحکہ خیز نظریہ قائم کرنے کی ضرورت صرف اس لئے پیش آئی کہ وہ دہریہ ہونے کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے وجود کا منکر تھا، اس لئے مذہب کو ماننا اس کے لئے ممکن نہیں تھا، چنانچہ اسے نظریۂ ارتقاء ایجاد کرنا پڑا اور ہر چیز کے وجود کی طبعی علت اور کیفیت نکالنی پڑی، مگر جو لوگ خالقِ کائنات کو مانتے ہیں جیسے اہلِ مذہب خصوصاً اہلِ اسلام وہ نظریۂ ارتقاء کے بجائے نظریۂ تخلیق کے قائل ہو سکتے ہیں، تو پھر ایسے مضحکہ خیز نظریہ کے قائل ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

اس سے ثابت ہوا کہ جس اصول نے ڈارون کو نظریۂ ارتقاء پیش کرنے پر مجبور کیا یعنی خدا کا انکار، خود اسی اصول میں مسلمان اس سے متفق نہیں ہیں، لہٰذا اصول میں تو یوں پیروی نہ ہوئی۔

رہی فرع، اس میں پیروی اس لئے ناممکن ہے کہ ڈارون جو بطور ارتقاء بندر کے انسان بن جانے کا

قائل ہے وہ کسی ایک فرد میں اس کا قائل نہیں ہے اور نہ ہی اس کو اس کی ضرورت ہے، بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ جس وقت ترقی کرتے کرتے حیوانی طبعیت میں انسان بننے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو اس وقت ایک بڑی تعداد میں بندر انسان بن گئے، جبکہ مسلمان اس کے قائل نہیں ہو سکتے، کیونکہ قرآن وحدیث میں پہلے انسان کا اکیلا پیدا ہونا بیان ہوا ہے۔[اٰل عمران، آیت:۵۹، الانعام، آیت:۹۸] لہٰذا فرع میں بھی پیروی نہ ہوئی۔

اس زمانے میں بعض بے باک، ناعاقبت اندیش، گستاخ لوگ اس بات کے قائل ہوگئے ہیں کہ جو بندر سب سے پہلے انسان بنا آدم اسی کا نام ہے، نعوذ باللہ من ذلک! اس بات میں گستاخی تو ہے ہی مگر افسوس یہ ہے کہ اس گستاخی کے باوجود بھی ڈارون کی موافقت نصیب نہ ہوئی۔ یعنی ؎

نہ خدا ملا، نہ وصالِ صنم　　نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

مثال ۲

بادلوں کی گرج، روایات میں اس کے پیدا ہونے کا سبب یہ بیان ہوا ہے کہ یہ فرشتے کی بادلوں کو ڈانٹنے کی آواز ہے۔[جامع ترمذی، حدیث:۳۱۱۷] اس کو محض اس لئے جھٹلانا کہ بعض آلات کے ذریعے اس کے پیدا ہونے کے اور اسباب دیکھے گئے ہیں، جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر ان دونوں میں اختلاف ہوتا تو ایک کی تصدیق سے دوسرے کو جھٹلانا لازم آتا۔ مگر یہاں کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لئے کہ ممکن ہے کبھی ایک قسم کے اسباب سے گرج پیدا ہوتی ہو، کبھی دوسری قسم کے اسباب سے، روایات میں ہمیشہ یہی سبب ہونے کا دعویٰ نہیں ہے اور مشاہدے سے تو ہمیشگی حاصل ہو ہی نہیں سکتی، دونوں نے بعض صورتوں کو بیان کیا ہے، یا مطلقاً بیان کیا ہے جو بعض کے حکم میں ہوتا ہے، لہٰذا ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جب اختلاف نہیں ہے تو دونوں کو سچا ماننا ممکن ہے، تو پھر روایات کو جھٹلانے کی کیا ضرورت ہے؟

مثال ۳

طاعون، روایات میں اس کا سبب یہ بیان ہوا ہے کہ یہ جنات کے کچوکے مارنے سے ہوتا ہے۔ [مسند احمد، حدیث:۱۹۷۴۳] یہ اس مشاہدے کے خلاف نہیں ہے جس میں اس کا سبب خاص کیڑے ثابت ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ دونوں میں سے کسی نے ہمیشہ یہی سبب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ دونوں نے بعض صورتوں کو بیان کیا ہے، یا مطلقاً بیان کیا ہے جو بعض کے حکم میں ہوتا ہے، لہٰذا دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مثال ④

بیماری کا متعدی نہ ہونا، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے۔[سنن ابوداؤد، حدیث:۳۹۱۱]اس کا بھی اس وقت تجربے کی بناء پر انکار کیا جاتا ہے، جبکہ ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ متعدی کی نفی کرنے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہ لازمی نہیں ہے، اس طرح کہ کبھی اس کے خلاف نہ ہو، اور مشاہدے سے بھی بیماری کا ہمیشہ متعدی ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا، بلکہ مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے کہ کبھی متعدی ہوتی ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتی۔

مثال ⑤

سات زمینوں کا ہونا، جو کہ قرآن وحدیث میں مذکور ہے۔[الطلاق، آیت:۱۲][مسند احمد، حدیث:۱۶۲۸]اس کا انکار محض اس وجہ سے کرنا کہ اب تک دیکھا نہیں، جائز نہیں ہے۔ کیونکہ کسی چیز کو نہ دیکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ چیز موجود ہی نہ ہو۔

سوال

روایات میں دوسری زمینوں کا ہماری زمین کے نیچے ہونا آیا ہے جبکہ ہم نے زمین کے اردگرد پھر کے دیکھ لیا ہے کسی جانب بھی وہ موجود نہیں ہیں۔

جواب

ممکن ہے کہ وہ وسیع فضا میں زمین سے اس قدر دور ہوں کہ نظر نہ آتی ہوں، یا بہت چھوٹی نظر آتی ہوں اور ہم ان کو ستارے سمجھتے ہوں اور نیچے ہونا بعض حالات یا اوقات کے اعتبار سے ہو یعنی بعض حالات یا اوقات میں وہ ہماری زمین کے نیچے ہوتی ہوں نہ کہ ہر وقت اور ہر حالت میں۔

مثال ⑥

یاجوج ماجوج کا موجود ہونا۔[الکہف، آیت:۹۴-۹۹] یہاں بھی نہ دیکھنے کو دلیل بنایا جارہا ہے جبکہ کسی چیز کو نہ دیکھنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا، ممکن ہے کہ جس قطب کی اب تک مکمل تحقیق نہیں ہوسکی وہاں موجود ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی جزیرہ ابھی تک دریافت ہونے سے رہ گیا ہو۔

مثال ⑦

آسمان کا ٹھوس جسم والا ہونا اور سات آسمانوں کا ہونا۔[الملک، آیت:۳] یہاں بھی نہ دیکھنے کو دلیل بنایا جاتا ہے جو کہ دلیل نہیں بن سکتا۔

مثال ﴿٨﴾

سورج اور چاند کا متحرک ہونا، جیسے کہ قرآن وحدیث میں ان کی طرف حرکت کی نسبت کی گئی ہے۔ [الانبیاء، آیت: ٣٣۔ یس، آیت: ٣٨، ٣٩، ٤٠] اس سے ہمارا مقصد سورج کے ساکن ہونے کا انکار کرنا ہے نہ کہ زمین کے متحرک ہونے کا، شریعت نے زمین کے متحرک یا ساکن ہونے کے حوالے سے کوئی بحث نہیں کی، ممکن ہے کہ سورج اور زمین دونوں میں خاص حرکت ہو۔

مثال ﴿٩﴾

قیامت کے قریب سورج کا مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہونا۔ [مسند احمد، حدیث: ٨٥٩٩] سورج کو ہمیشہ مشرق سے طلوع ہوتے ہوئے دیکھنا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ مغرب سے طلوع ہونا محال ہو کیونکہ ہمیشگی کا مطلب یہ نہیں کہ یہ لازمی ہو اس کے خلاف کبھی نہ ہو سکے۔

مثال ﴿١٠﴾

معراج کے وقت نبی ﷺ کا اوپر تشریف لے جانا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ٣٢٠٧] اس وقت اس وجہ سے کہ بغیر آکسیجن کے خلا میں زندہ رہنا محال ہے واقعۂ معراج کا انکار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ خلا میں انسان کا زندہ رہنا اس وقت محال ہے جب وہاں کچھ دیر تک قیام ہو، اور اگر بجلی کی طرح اسے عبور کر لیا جائے تو پھر یہ محال نہیں ہے، جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر انگلی کو کچھ دیر تک آگ میں رکھا جائے تو جل جاتی ہے لیکن اگر جلدی سے نکال لیں تو نہیں جلتی حالانکہ آگ کے اندر سے انگلی کو گزارا ہے۔ اسی طرح اگر معراج کے دوران خلا کو فوراً عبور کر کے اوپر آسمانوں پر لے جایا گیا ہو اور وہاں آکسیجن یا آکسیجن کی خصوصیات والی کوئی اور چیز موجود ہو تو اس میں کون سی مشکل بات ہے؟

❀...❀...❀

تنبیہ ﴿١١﴾

تقدیر

تقدیر کی بنیاد اللہ کا علم اور ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کو ماننے والے کے لئے تقدیر کو ماننا بھی ضروری ہے، آج کل تقدیر میں چند غلطیاں کی جا رہی ہیں۔

غلطی ﴿۱﴾

بعض لوگ تو سرے سے تقدیر کا انکار کرتے ہیں، اور انکار کی وجہ صرف ان کا یہ خیال ہے کہ تقدیر کو ماننے سے تدبیر کا انکار لازم آتا ہے اور تدبیر کا انکار کم ہمتی اور پستی کی اصل بنیاد ہے۔

جواب

دراصل یہ خیال ہی غلط ہے، کوئی شخص اپنی غلط فہمی کی وجہ سے تدبیر کا انکار کرے تو یہ عقیدہ اس کا ذمہ دار نہیں، لیکن شریعت نے تدبیر کو غلط نہیں کہا بلکہ اس کی ترغیب دی ہے۔ جیسے کہ محنت کرنا، [النجم، آیت:۳۹] رزق کمانے کے لئے تگ و دو کرنا، [الجمعہ، آیت:۱۰] سفر کے وقت ضروری سامان ساتھ رکھنا، [البقرہ، آیت:۱۹۷] دشمن سے مقابلے کے لئے تیاری رکھنا، [الانفال، آیت:۶۰] وغیرہ جیسی ہدایات قرآن وحدیث میں واضح طور پر موجود ہیں۔

اشکال

کیا دوا اور دعاء تقدیر کو ٹال سکتی ہیں؟

جواب

ایک حدیث میں اس اشکال کا جواب کیا مختصر اور کافی شافی دیا گیا ہے: ''هِيَ مِنْ قَدَرِ اللهِ'' [سنن ابن ماجہ، حدیث:۳۴۳۷] ترجمہ: ''یہ بھی تقدیر میں سے ہیں۔'' یعنی دوا اور دعاء بھی تقدیر کا حصہ ہیں، تقدیر سے باہر نہیں ہیں۔

غلطی ﴿۲﴾

بعض حضرات نے واضح آیات اور روایات کے ہوتے ہوئے انکار کی گنجائش تو نہیں دیکھی مگر یہ سمجھ کر کہ اس سے انسان کا مجبور ہونا لازم آتا ہے حالانکہ یہ مشاہدے کے خلاف ہے اس کی تشریح بدل ڈالی۔ اس کی تشریح یہ کی کہ تقدیر علمِ الٰہی کا نام ہے اور علم چونکہ معلوم میں دخل انداز نہیں ہوتا اس لئے اس سے مجبور ہونے والا اشکال لازم نہیں آتا، اس کی مثال یہ دی کہ جیسے نجومی اگر یہ پیش گوئی کرے کہ فلاں شخص فلاں دن کنویں میں گر کر مر جائے گا اور واقعی ایسا ہو جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نجومی نے اس شخص کو قتل کر دیا۔

جواب

قرآن وحدیث پر نظر رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے اور عقل بھی مانتی ہے کہ جس طرح کوئی واقعہ علمِ

الٰہی سے باہر نہیں ہے اسی طرح کوئی واقعہ اللہ کے ارادے سے بھی خالی نہیں ہے اور یہی تقدیر ہے۔ بس اگر کوئی شخص اس کا نام تقدیر نہ رکھے پھر بھی اللہ کے ارادے سے انکار تو نہیں کرسکتا تو پھر تقدیر کی تشریح بدلنے سے اشکال کہاں دور ہوا؟

اصل غلطی

اصل میں خود یہی بات غلط ہے کہ ارادۂ الٰہی کے خلاف کے محال ہونے سے اختیار کی نفی لازم آتی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں: ایک الزامی، ایک تحقیقی۔

الزامی جواب

اگر اس سے اختیار کی نفی لازم آتی ہے تو چونکہ خود اللہ کے کام بھی اللہ کے ارادے سے ہوتے ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھی اپنے کاموں پر اختیار نہ ہو حالانکہ کوئی عقل وشعور رکھنے والا شخص اس کا قائل نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ارادۂ الٰہی کے خلاف کے محال ہونے سے اختیار کی نفی لازم نہیں آتی۔

تحقیقی جواب

ارادۂ الٰہی کا تعلق بندوں کے کاموں کے محض ہونے سے نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے اختیار کے ساتھ ہونے سے ہے، چنانچہ اس سے بندوں کا اختیار اور مضبوط ہوگیا نہ کہ ختم ہوا۔

ایک اشکال

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ تقدیر کو ماننے والے ہیں وہ نکمے ہو کر بیٹھے رہتے ہیں۔

جواب

یہ ان کی اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ہے نہ کہ اس عقیدے کو ماننے کی وجہ سے۔ اگر ایسا ہوتا تو نعوذ باللہ صحابہ رضی اللہ عنہم سب سے زیادہ کم ہمت ہوتے، جبکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقدیر کو ماننے کا اثر تو یہ ہے کہ اگر تدبیر کمزور ہو تب بھی کام شروع کردے۔ جیسے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی نظر چونکہ اللہ تعالیٰ پر ہوتی تھی اس لئے بے سروسامانی کے باوجود خطرناک معرکوں میں بے دریغ گھس جاتے تھے۔ یہی مفہوم ہے اس آیت کا: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرہ، آیت: ۲۴۹] ترجمہ: ''کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔''

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی عدالت میں مقدمہ ہار گیا تو اس نے مایوس ہو کر کہا: ''حَسْبِيَ اللهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ'' ترجمہ: ''مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔'' اس پر آپ ﷺ نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ''إِنَّ اللهَ يَلُوْمُ عَلَى الْعَجْزِ وَلٰكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَيْسِ فَإِذَا غَلَبَكَ أَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِيَ اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ'' [سنن ابو داؤد، حدیث: ٣٦٢٧] ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ بے وقوفی کو پسند نہیں کرتا۔ تمہیں سمجھداری سے کام لینا چاہئے، (اور معاملے کا ثبوت رکھنا چاہیے) ہاں جب تمام تدابیر اختیار کرنے کے باوجود مغلوب ہو جاؤ تو پھر معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔''

تقدیر کا اثر

تقدیر کا اثر یہ ضرور ہے کہ تقدیر کو ماننے والا تدبیر کو مؤثرِ حقیقی نہیں سمجھے گا اور یہی صحیح عقلی اور نقلی دلیل کا تقاضا ہے۔ اس پر ملامت کیا ہو سکتی ہے؟ بلکہ اگر اس کے خلاف عقیدہ ہو تو وہ قابلِ ملامت ہے۔ ایسا شخص تدبیر کی حیثیت اتنی ہی سمجھے گا جتنی حیثیت ریل گاڑی کو روکنے کے لئے لال جھنڈی لہرانے کی ہوتی ہے کہ جب چوکیدار ریل گاڑی کو روکنا چاہتا ہے تو تدبیر تو یہی اختیار کرتا ہے مگر نظر اس کی ڈرائیور پر ہوتی ہے۔

دوسرا اشکال

رہا یہ اشکال کہ جب تقدیر عقل اور نقل دونوں سے ثابت شدہ ہے تو اس میں بحث کرنے سے روکا کیوں جاتا ہے؟

جواب

اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض شبہات عقلی نہیں ہوتے بلکہ طبعی ہوتے ہیں، ان کو دور کرنے کے لئے دلیل کافی نہیں ہوتی بلکہ فطرتِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے، چونکہ فطرتِ سلیم والے لوگ کم ہیں اور بحث کرنے سے ایسے شبہات کے بڑھنے کا خطرہ ہے جو کہ دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے نقصان دہ ہیں، اس لئے نبی ﷺ نے شفقت اور حکمت کے پیشِ نظر تقدیر میں بحث کرنے سے منع کر دیا۔ [مسند احمد، حدیث: ٦٦٦٨] جیسے کہ شفیق ڈاکٹر کمزور مریض کو زیادہ طاقت ور غذا استعمال کرنے سے روک دیتا ہے۔

❋...❋...❋

تنبیہ ⑭

اسلام کے ارکان اور عبادات

اسلام کے ارکان اور عبادات میں چند غلطیاں کی جارہی ہیں۔

غلطی ①

بعض لوگوں نے اسلام کے ارکان اور عبادات میں یہ غلطی کی کہ ان احکام کو مقصود نہیں سمجھا بلکہ اپنی عقل سے ہر حکم کی کوئی حکمت نکال کر اس حکمت کو مقصود سمجھا اور ان حکمتوں، مصلحتوں کو دوسرے طریقوں سے حاصل کرنے کے بعد احکام کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ مثلاً نماز میں اخلاق کی اصلاح، وضو میں صفائی ستھرائی، روزے میں حیوانی قوتیں اعتدال میں لانے، زکوٰۃ میں پسماندہ لوگوں کی مدد، حج میں معاشرتی اجتماع اور ترقی وتجارت، تلاوتِ قرآن میں صرف معانی ومطالب سمجھنے، دعاء میں صرف دل کی تسلی اور جہاد فی سبیل اللہ میں صرف قیامِ امن وآزادی کو مصلحت قرار دیا، اور جب ان مصلحتوں کی ضرورت نہ رہی یا جب یہ مصلحتیں دوسرے ذرائع سے حاصل ہوگئیں تو احکام کو لایعنی قرار دے دیا، اور جب اتنی جرأت کرلی تو پھر مصلحتوں کے حصول کا انتظار بھی نہ رہا احکام کو بالکل ہی چھوڑ دیا۔

غلطی ②

اپنی عقل سے احکام کی مصلحتیں نکالنے سے ایک اور خرابی یہ پیش آئی کہ احکام کو ہی بدل دیا، جیسے اِس وقت بعض لوگوں نے قربانی کے بارے میں کہا ہے کہ اِس سے مقصود اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔ اُس زمانے میں مویشی عام ہونے کی وجہ سے یہی صورت تھی، اب پیسوں کا زمانہ ہے، لہٰذا اس کی صورت بدل دینی چاہیے۔

دونوں غلطیوں کا جواب

کہاں تک یہ حکمتیں نکالی جائیں گی؟ کیا کوئی شخص رکعات کی تعداد کی حکمت بتا سکتا ہے؟ اگر عقل ان چیزوں کے لئے کافی ہوتی تو انبیاء علیہم السلام کے آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ دنیا میں بہت سارے عقل منداور دانش ور ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔

دراصل ایسی مصلحتیں نکالنا جو سراسر دنیاوی فائدے پر مشتمل ہوں درپردہ آخرت کے مقصود ہونے سے انکار کرنا ہے۔ نیز چونکہ وہ دوسرا جہاں ہے اس لئے عین ممکن ہے کہ اس کی خاصیتیں یہاں کی خاصیتوں سے مختلف ہوں، اور وہ خاصیتیں ہمیں معلوم نہ ہوں جبکہ اُن کا حاصل ہونا اِن اعمال پر موقوف

ہواور اِن اعمال اوراُن خاصیتوں کے درمیان خاص تعلق ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو۔

اس کے علاوہ اگر کوئی شخص ملکی قوانین کے ساتھ اسی طرح سلوک کرے کہ ہر قانون کی کوئی مصلحت نکال لے پھر اس مصلحت کو دوسرے آسان طریقے سے حاصل کر کے اصل قانون پر عمل کرنے سے انکار کردے تو ہر کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ حکومت اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔

عام سی بات ہے کہ اگر عدالت کسی شخص کو عدالت میں حاضر ہو کر گواہی دینے کا آرڈر جاری کرے اور وہ شخص مقررہ تاریخ پر حاضر نہ ہو بلکہ یہ کہے کہ حاضری سے مقصود گواہی دینا ہے اور اس کا دوسرا آسان طریقہ بھی موجود ہے، وہ یہ کہ تمام باتیں لکھ کر ڈاک کے ذریعے بھیج دی جائیں۔ چنانچہ اس طریقہ پر عمل کرتے ہوئے تمام متعلقہ باتیں لکھ کر دستخط کر کے ڈاک کے ذریعے بھیج دے اور خود گھر بیٹھا رہے، تو کیا یہ شخص اس سزا کا جو سمن میں مذکور تھی ”کہ اگر حاضر نہ ہوا تو وارنٹ جاری کئے جائیں گے“، مستحق نہیں ہوگا؟ اگرچہ جج اس شخص کے دستخط پہچانتا ہی کیوں نہ ہو۔

غلط فہمی ①

ہماری اس بات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم شریعت کے احکام کو حکمتوں اور مصلحتوں سے خالی سمجھتے ہیں یا یہ کہ امت کے فقہاء کو ان حکمتوں کا بالکل علم نہیں ہو سکا۔

جواب

یقیناً ان میں بہت ساری حکمتیں ہیں اور کچھ حکمتوں پر فقہاء مطلع ہوئے بھی ہیں اور اب بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن احکام پر عمل کرنے کا دارومدار ان حکمتوں کے علم ہونے پر نہیں ہے۔ اگر ان حکمتوں کا علم نہ بھی ہو تب بھی احکام پر عمل کرنا ضروری ہے۔

یہ بعینہٖ ملکی قانون کی طرح ہے کہ عوام کا اس کو ماننے کے لئے اس کی حکمت معلوم ہونے کا انتظار کرنا جرمِ عظیم ہے۔ اور پھر جو حکمتیں بیان کی جاتی ہیں وہ صرف اپنی صوابدید پر کی جاتی ہیں۔ اور حکمتوں کے بارے میں جتنا علم ہے وہ اندازہ اور گمان پر مبنی ہے۔ اور بعض حکمتوں کا علم بالکل ہی نہیں ہے اور اس میں کوئی حیرت والی بات بھی نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گھر کے ملازم کو بعض گھریلو انتظامات کی وجہ معلوم نہیں ہوتی حالانکہ وہ ملازم بھی گھر کے مالک کی طرح مخلوق ہے۔ جب مخلوق کو مخلوق کے بعض راز معلوم نہیں ہوتے، حالانکہ دونوں کا علم ایک ہی طرح محدود ہے تو اگر خالق کے رازوں کا مخلوق کو بالکل پتہ نہ ہو یا صحیح پتہ نہ ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ جبکہ دونوں کے علم میں بے انتہاء فرق ہے۔ بلکہ ایک فلسفی کے بقول اگر سب احکام کی عقلی وجوہات مکمل طور پر معلوم ہو جائیں تو شبہ ہوگا کہ شاید کسی عقل مند

شخص یا جماعت نے یہ مذہب خود گھڑا ہے، کیونکہ دوسرے دانشور حضرات بھی تمام عقلی وجوہات تک پہنچ گئے۔ خدائی مذہب کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ اس کے اسرار ورموز تک کسی کو مکمل رسائی نہ ہو۔

غلط فہمی ۲

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جن احکام کی عقلی وجہ سمجھ میں نہیں آتی وہ عقل کے خلاف ہیں۔

جواب

ہرگز ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ عقل کے خلاف ہونا اور چیز ہے اور عقل میں نہ آنا اور چیز ہے۔ لہٰذا عقل میں نہ آنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہیں۔

❁...❁...❁

تنبیہ ۱۳

معاملات اور سیاسات

معاملات اور سیاسیات میں کئی غلطیاں کی جارہی ہیں۔

غلطی ۱

ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ معاملات اور سیاسیات کو دین اور شریعت کا حصہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کو صرف معاشرتی کام سمجھ کر ان کا دارومدار ''رائے'' اور ''زمانے کی مصلحت'' پر قرار دیتے ہیں اور اپنے آپ کو ان میں مکمل با اختیار سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے سود تک کو حلال کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، بلکہ علماء کو بھی اس کا مشورہ دیتے ہیں، اور ان کے قبول نہ کرنے پر غصے ہوتے ہیں، اور ان کو ترقی کا دشمن سمجھتے ہیں۔

جواب

سب سے پہلے کسی چیز کے شریعت کے تحت داخل ہونے یا نہ ہونے کے معیار کی تحقیق کرلی جائے، تاکہ اس بات کا فیصلہ آسانی سے ہوسکے کہ یہ چیز شریعت کے تحت داخل ہے یا نہیں، اور وہ معیار صرف ایک ہی چیز ہے ''ثواب کا وعدہ یا عذاب کی وعید''

آپ قرآن وحدیث میں غور کریں تو جابجا معاملات اور سیاسیات کے بارے میں ثواب کے وعدے اور عذاب کی وعیدیں نظر آئیں گی، لہٰذا جب یہ چیزیں معیار کے تحت آگئیں تو اب ان کے شریعت کا جزء ہونے میں کیا شبہ باقی رہا؟

غلطی ۲

معاملات اور سیاسیات کے جو مسائل قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہیں بلکہ اجتہاد سے ثابت ہیں ان کے شریعت کے جزء ہونے میں شبہ باقی رہا۔

جواب

اجتہاد کے ذریعے حکم صرف معلوم کیا جاتا ہے، لگایا نہیں جاتا، اصل حکم لگانے والے قرآن و حدیث ہی ہیں، اس لئے ایسے مسائل بھی بلا شبہ شریعت کا حصہ ہیں۔

غلطی ۳

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مجتہدین کی طرح ہم بھی اجتہاد کر سکتے ہیں، اور اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

جواب

مجتہد کی خاص شرائط ہیں جو اصول فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ ہر شخص مجتہد نہیں ہوسکتا، اور جو مجتہد نہ ہو شریعت میں اس کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اس سے ان سب شبہات کا جواب ہو گیا جو ایک سے زائد بیویوں، طلاق، سود، تجارت کی جدید صورتوں، بیمہ، ملازمت کی نئی صورتوں، میراث اور اہل حرب کے ساتھ قتال کے متعلق پیش کئے جاتے ہیں، یعنی یہ چیزیں چونکہ شریعت کا حصہ ہیں اور ان کا حکم شریعت میں موجود ہیں، اس لئے ان میں کسی کو اختیار نہیں ہے، بلکہ شریعت کے حکم پر عمل کرنا ضروری ہے۔

غلطی ۴

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ معاملات اور سیاسیات کے بعض احکام کو ہم معاشرے کے لئے تنگی کا باعث دیکھتے ہیں لہٰذا یا تو وہ احکام الٰہیہ نہیں ہیں یا اُس زمانے کے ساتھ خاص ہیں۔

جواب

اِس دور میں چونکہ اکثر لوگ شریعت پر عمل نہیں کر رہے تو جب بعض لوگ عمل کریں گے اور انہیں اکثریت سے واسطہ پڑے گا تو انہیں تنگی محسوس ہو گی لیکن اس تنگی کی وجہ اکثریت کی شریعت سے دوری ہے نہ کہ خود شریعت کے احکام۔

لہٰذا ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اپنی طرف سے ان احکام کی زبردستی مصلحتیں نکال کر آیات واحادیث کے غلط مفہوم گھڑیں اور احکام کو بدل دیں، جیسے کہ اپنے آپ کو اسلام کا خیر خواہ کہنے والوں کی عادت ہوگئی ہے کہ اعتراض کرنے والوں سے دلیل کے مطالبے کو بے ادبی سمجھ کر اعتراض کو تسلیم کر لیتے ہیں پھر خود اس حکم کو احکام کی فہرست سے نکال کر اس کی جگہ دوسرا گھڑا ہوا حکم شامل کر کے اس آیت کا مصداق بنتے ہیں: ﴿وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۝﴾ [آل عمران، آیت:۷۸] ترجمہ:"ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی، وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔"

خرابی کی اصل جڑ

خرابی کی اصل جڑ دنیا کی محبت اور اہلِ دنیا کی خوشامد ہے۔ جن دنیا والوں کی خوشامد میں اعتراضات کو تسلیم کر کے اسلامی اصولوں کو بدلا جاتا ہے اگر وہ دنیا والے ان اسلامی اصولوں کو تسلیم کر لیں تو یہ خوشامدی فوراً اپنی پہلی رائے چھوڑ کر ان اعتراضات کو غلط کہنے لگ جائیں گے۔ غرض ایسے لوگوں کی ساری توجہ دنیا والوں کی خوشامد پر ہے، جدھر وہ خوش ہوں گے ادھر یہ پھر جائیں گے، جیسے جہاز کا نمازی جہاز گھومنے سے خود بھی گھوم جاتا ہے۔

❀...❀...❀

تنبیہ ⑬

معاشرت اور خاص عادات

معاشرت اور خاص عادات میں کئی غلطیاں کی جارہی ہیں۔

غلطی ①

ایک غلطی تو یہ کی جاتی ہے کہ معاشرت اور خاص عادات کا تعلق دین سے نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان کا دارومدار اپنی ذاتی آسائش، آرائش، پسند اور مصلحت پر سمجھا جاتا ہے۔

جواب

قرآن وحدیث میں معاشرت اور خاص عادات کے بارے میں وعدے اور وعیدیں موجود ہیں، لہٰذا یہ دین کا حصہ ہیں، البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن چیزوں کے بارے میں کوئی حکم نہیں ہے نہ کوئی خاص حکم نہ کوئی اصولی حکم، ان میں بے شک اختیار ہے جس طرح چاہیں انہیں سرانجام دیں لیکن جن چیزوں کے بارے میں کوئی خاص حکم یا اصولی حکم قرآن وحدیث میں آگیا ہے ان میں ہرگز کسی کو اختیار نہیں ہے۔

خاص حکم کی مثالیں

(۱) ریشمی کپڑا پہننا مردوں کے لئے حرام ہے۔[سنن ابوداؤد، حدیث: ۴۰۵۷۔ جامع ترمذی، حدیث: ۱۷۲۰]

(۲) مردوں کے لئے ٹخنوں سے نیچے کپڑا یعنی شلوار، چادر وغیرہ لٹکانا حرام ہے۔[سنن ابوداؤد، حدیث: ۴۰۹۳]

(۳) داڑھی کٹوانا یا منڈوانا حرام ہے۔[صحیح بخاری، حدیث: ۵۸۹۲]

(۴) جاندار کی تصویر رکھنا اور بنانا حرام ہے۔[سنن ابوداؤد، حدیث: ۲۲۷، ۵۰۲۴]

(۵) بغیر ضرورت کے کتا پالنا گناہ ہے۔[سنن ابوداؤد، حدیث: ۲۲۷]

(۶) بغیر ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے۔[المائدہ، آیت: ۳]

(۷) شراب حرام ہے چاہے غذا کے طور پر استعمال کی جائے یا دوا کے طور پر، چاہے اندرونِ جسم میں استعمال کی جائے یا بیرونِ جسم میں۔[المائدہ، آیت: ۹۰]

اصولی حکم کی مثالیں

(۱) کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا ناجائز ہے چاہے لباس میں ہو یا کھانے پینے کے طریقوں میں ہو یا کسی اور چیز میں۔[صحیح بخاری، حدیث: ۵۸۹۲۔ مسند احمد، حدیث: ۸۷۸۵، ۲۲۲۸۳]

(۲) دھوکہ دہی سے یا دلی خوشی کے بغیر دوسرے کا مال لینا ناجائز ہے۔[مسند احمد، حدیث: ۲۰۶۹۵]

(۳) جو سواری اور لباس غرور وتکبر کے اظہار کے لئے ہو اس سے بچنا ضروری ہے۔[مسند احمد، حدیث: ۲۷۵۹۳، ۵۶۶۴]

ان چیزوں کا حکم چونکہ قرآن وحدیث میں آگیا ہے اس لئے ان میں کسی شخص کو اختیار نہیں ہے۔

غلطی ②

اس زمانے میں آزادی کو ایک خاص کلچر بنا دیا گیا ہے اور اس کا زیادہ تر استعمال ایسے ہی کاموں میں کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے علماء کے سامنے مختلف اعتراضات پیش کرتے رہتے ہیں۔

اعتراض ①

کبھی ان احکام کا ثبوت قرآن سے مانگا جاتا ہے۔

جواب

شریعت کے چار اصول ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ شرعی احکام ان چاروں سے ثابت ہوتے ہیں، صرف قرآن سے ثبوت مانگنا غلط ہے۔

اعتراض ②

کبھی حدیثوں میں شبہات نکالے جاتے ہیں کہ یہ محفوظ نہیں ہیں۔

جواب

احادیث کے الفاظ اور معانی دونوں محفوظ ہیں، چنانچہ احادیث کے متن، اسناد اور اسماء الرجال کی کتابیں غور سے دیکھنے سے دل کو پوری طرح تسلی ہو جاتی ہے۔

اعتراض ③

کبھی اپنی طرف سے ان احکام کی علتیں نکال کر ان میں ردو بدل کر دیا جاتا ہے۔

جواب

اول تو غیر مجتہد احکام کی علت نہیں نکال سکتا، دوسرا احکام میں ردو بدل کرنے کے لئے علت نکالنا ویسے ہی ناجائز ہے۔

اعتراض ④

کبھی ان احکام کی عقلی وجہ دریافت کی جاتی ہے۔

جواب

شریعت کے احکام نقل (قرآن وحدیث وغیرہ) سے ثابت ہیں، اور محض نقل سے ثابت شدہ چیزوں کی عقلی وجہ پوچھنا درست نہیں۔

اعتراض ⑤

کبھی ان احکام کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

جواب

شریعت کے احکام کا مذاق اڑانے سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

اعتراض ⑥

کبھی ان احکام کی خودساختہ مصلحتیں بیان کی جاتی ہیں۔

جواب

خودساختہ مصلحتیں بیان کرنے میں بہت ساری خرابیاں ہیں، سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اگر یہ مصلحت ناقص نکل آئے تو اس کی وجہ سے متعلقہ حکم ناقص ٹھہرتا ہے، اور جزء کے ناقص ہونے سے کل کا ناقص ہونا لازم آتا ہے، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ پوری شریعت ہی ناقص ہو۔ العیاذ باللہ

اصل بات

اصل بات یہ ہے کہ شریعت قانونِ خداوندی ہے، اور قانون کے سامنے کسی کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اور نہ قانون کی حکمت پوچھنے کی اجازت ہوتی ہے، اور اگر کبھی کوئی حکمت یا مصلحت بات سمجھانے کے لئے بتادی جائے تو یہ محض احسان ہے۔

آج کل مزاج ایسا بگڑ گیا ہے کہ ایسی باتوں کو بڑی وقعت دیتے ہیں، چنانچہ ہم بھی اپنی صوابدید پر اتنا بتادیتے ہیں کہ کیا کسی شخص کا اپنی بیوی کے کپڑے پہن کر مجلس میں آنا صرف مشابہت کی وجہ سے برا نہیں لگے گا؟ اور کیا جج حضرات عدالت میں آنے والے وکیلوں کو مخصوص لباس پہننے کا پابند نہیں کرتے؟ اور کیا اس کی خلاف ورزی عدالت کی توہین نہیں ہے؟ تو کیا شریعت کو اتنی دخل اندازی کا حق بھی حاصل نہیں ہے؟

❋...❋...❋

تنبیہ ⑮

باطنی اخلاق

باطنی اخلاق میں چند غلطیاں کی جارہی ہیں۔

غلطی ①

ایک غلطی تو یہ کی جاتی ہے کہ باطنی اخلاق کو دین کا حصہ نہیں سمجھا جاتا۔

جواب

باطنی اخلاق پر ثواب یا گناہ ملنے کا ذکر قرآن وحدیث میں موجود ہے، لہٰذا یہ دین کا حصہ ہیں۔

غلطی ②

بعض اچھے اور برے اخلاق کو خلط ملط کر دیا گیا ہے، یعنی بعض اخلاق کو اچھے نام دے کے اچھا قرار دیا گیا ہے جبکہ حقیقت میں وہ برے ہیں اور بعض کو برے نام دے کر برا قرار دیا گیا ہے جبکہ حقیقت میں وہ اچھے ہیں۔

پہلی قسم

وہ اخلاق جنہیں اچھا کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ برے ہیں۔

① ان میں سے ایک وہ ہے جسے ترقی کا نام دیا جاتا ہے جبکہ اس کی حقیقت مال کی اور عہدے کی حرص ہے۔

② دوسرا وہ ہے جس کا نام عزت رکھا جاتا ہے جبکہ اس کی حقیقت تکبر ہے۔

③ تیسرا وہ ہے جسے قومی ہمدردی کہا جاتا ہے جبکہ اس کی حقیقت تعصب ہے جس میں حق ناحق کا فرق نہیں کیا جاتا۔

④ چوتھا وہ ہے جسے سیاسی حکمت عملی کہتے ہیں جبکہ اس کی حقیقت فریب اور دھوکہ دہی ہے۔

⑤ پانچواں وہ ہے جسے زمانے کے ساتھ چلنا کہا جاتا ہے جبکہ اس کی حقیقت منافقت ہے۔

جواب

حقیقت میں یہ سب برے اخلاق ہیں، قرآن وحدیث میں ان کی مذمت کی گئی ہے، ان سے بچنا چاہیے۔

دوسری قسم

وہ اخلاق جنہیں برا کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اچھے ہیں۔

① ان میں سے ایک قناعت ہے جسے کم ہمتی کہتے ہیں۔

② دوسرا توکل ہے جسے کام چوری کا نام دیا جاتا ہے۔

۳ تیسرا دینی غیرت وحمیت ہے جسے انتہا پسندی اور شدت پسندی کہا جاتا ہے۔
۴ چوتھا سادگی ہے جسے بدتہذیبی کہتے ہیں۔
۵ پانچواں تقویٰ ہے جسے وہم اور وسوسہ کا نام دیتے ہیں۔
۶ چھٹا فضول صحبت سے کنارہ کشی ہے جسے گوشہ نشینی کہتے ہیں۔

جواب

حقیقت میں یہ سب اچھے اخلاق ہیں، قرآن وحدیث میں ان کی تعریف کی گئی ہے، ان کو اپنانا چاہیے۔

غلطی ۳

بعض برے اخلاق کا نام تو نہیں بدلا مگر ان کو اچھا سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔
مثلاً: بدگمانی، ظلم، غریبوں کی حق تلفی، مسکینوں کے ساتھ برا سلوک، دوسروں کو حقیر سمجھنا، اہل علم کی غیبت اور عیب جوئی، ادب کی کمی، فخر، ریا کاری، فضول خرچی، آخرت سے غفلت۔

جواب

یہ سب برے اخلاق ہیں۔ ان پر قرآن وحدیث میں وعیدیں موجود ہیں۔ ان سے بچنا ضروری ہے۔

❁...❁...❁

تنبیہ ۱۶

عقلی دلیل

آج کل اس کا استعمال بہت ہے مگر اس کے باوجود اس میں چند غلطیاں کی جا رہی ہیں۔

غلطی ۱

ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ عقلی دلیل کو ہر حال میں نقلی دلیل پر ترجیح دیتے ہیں۔

جواب

عقلی دلیل کو صرف اس وقت نقلی دلیل پر ترجیح دی جاتی ہے جب عقلی دلیل قطعی اور نقلی ظنی ہو۔ اور جب نقلی دلیل قطعی اور عقلی ظنی ہو یا دونوں ظنی ہوں تو اس صورت میں نقلی دلیل کو ترجیح دی جائے گی۔

غلطی ﴿۲﴾

انداز ے اور تجربے کو عقلی دلیل سمجھتے ہیں۔

جواب

یہ عقلی دلیل نہیں ہیں۔ عقلی دلیل کہتے ہیں ''عقل کا کسی چیز کے موجود ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگانا'' جیسے دھوپ دیکھ کر عقل کا سورج کے موجود ہونے کا حکم لگانا۔

غلطی ﴿۳﴾

شرعی احکام کو عقل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جواب

شرعی احکام نقل (قرآن وحدیث وغیرہ) سے ثابت ہیں، عقل سے ثابت کرنا درست نہیں ہے۔

غلطی ﴿۴﴾

نظیر کو دلیل سمجھ کر اسی پر اکتفاء کر لیتے ہیں۔

جواب

نظیر الگ چیز ہے اور دلیل الگ چیز، دعوے کو ثابت کرنے کے لئے دلیل پیش کرنا ضروری ہے، نظیر پیش کرنا کافی نہیں ہے۔

غلطی ﴿۵﴾

دلیل پیش کرنے کے باوجود نظیر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

جواب

دلیل کا مطالبہ کرنا درست ہے، نظیر کا نہیں۔

غلطی ﴿۶﴾

ممکن چیز پر عقلی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں۔

جواب

جو چیز عقلاً ممکن ہو اس کا وجود کبھی نقلی دلیل سے ثابت ہوتا ہے کبھی عقلی دلیل سے، صرف عقلی دلیل کا مطالبہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

غلطی ﴿۷﴾

عجیب کو ناممکن سمجھتے ہیں۔

جواب

عجیب الگ چیز ہے اور ناممکن الگ۔ عجیب خلافِ عادت کو کہتے ہیں جبکہ ناممکن خلافِ عقل کو۔ عجیب واقع ہوسکتا ہے جبکہ ناممکن واقع نہیں ہوسکتا۔

غلطی ﴿۸﴾

عادت اور عقل کے احکام کو ایک جیسا سمجھتے ہیں۔

جواب

عادت اور عقل دونوں کے احکام الگ الگ ہیں، ان کو ایک جیسا سمجھنا غلط ہے۔

❋...❋...❋

آخری گزارش

فی الحال اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ بعد میں اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے یا کسی اور کو توفیق بخشی تو اس موضوع پر مزید لکھا جائے گا۔ یہ رسالہ گویا حصہ اول بن جائے گا اور باقی اضافہ جات دوسرے حصے۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الْاَمْجَادِ اِلٰی یَوْمِ التَّنَادِ

۲۱ رجب ۱۳۳۰ھ بمطابق ۷ جولائی ۱۹۱۲ء

❋...❋...❋

تقریظ

حضرت مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی صاحب مدظلہ

Hafiz
Fazal-ur-Rahim
Ashrafi

- Chancellor: Jamia Ashrafia, Lahore
- Patron: Wifaq ul Madaris Al-Arabia, Pakistan
- President: Rabita Adab-e-Islami Pakistan
- Member: Central Ruet-e-Hilal Committee Pakistan
- Patron: Ashrafia Girls College Lahore
- Member: Quran Board Punjab

الجامعة الأشرفية

حافظ
فضل الرحیم اشرفی

- مہتمم و شیخ الحدیث، جامعہ اشرفیہ لاہور
- سرپرست، وفاق المدارس العربیہ پاکستان
- صدر، رابطہ ادب اسلامی پاکستان
- ممبر مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
- سرپرست، اشرفیہ گرلز کالج لاہور
- ممبر قرآن بورڈ پنجاب

Ref. # .... **Dated** .13-05-24.

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ اما بعد

الانتباہات المفیدہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب کا حصہ بھی ہے۔ اس کتاب میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے سات انتہائی قیمتی اصول ذکر کئے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں اسلام کے عقائد و مسائل کے سلسلے میں جو شبہات پیدا ہوتے ہیں ان سات اصولوں کی روشنی میں حضرت رحمہ اللہ نے ان تمام کا حل ذکر کیا ہے۔

اس کتاب پر متعدد علماء نے مختلف انداز سے کام کیا ہے بعض حضرات نے اس کی تعریب کی ہے اور بعض نے اس کی تلخیص کی ہے۔

عزیزم مفتی محمد طلحہ صادق سلمہ نے اس کتاب کی تسہیل کا کام کیا ہے بندہ اپنی ضعف طبع کی بنا پر مکمل کتاب تو نہ دیکھ سکا البتہ چیدہ چیدہ مقامات سے دیکھا ماشاء اللہ اچھی محنت کی ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ جل شانہ موصوف کی محنت کو قبول فرمائے اور اسی طرح دین متین کی خدمت کی توفیق نصیب فرمائے۔

آمین یارب العالمین

محتاج دعاء

فضل الرحیم

حافظ فضل الرحیم

جامعہ اشرفیہ لاہور

Postal Address: House # 1, JAMIA ASHRAFIA Ferozepur Road, Lahore
Ph: +92-42-37429591 Fax: +92-42-37552986 E-Mail: hfrahim@gmail.com Website: www.jamiaashrafia.org

مکتبۃ الذکر
0304-9366766